راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

Monthly Arxang Lahore

مدیرِ اعلیٰ
عامر بن علی

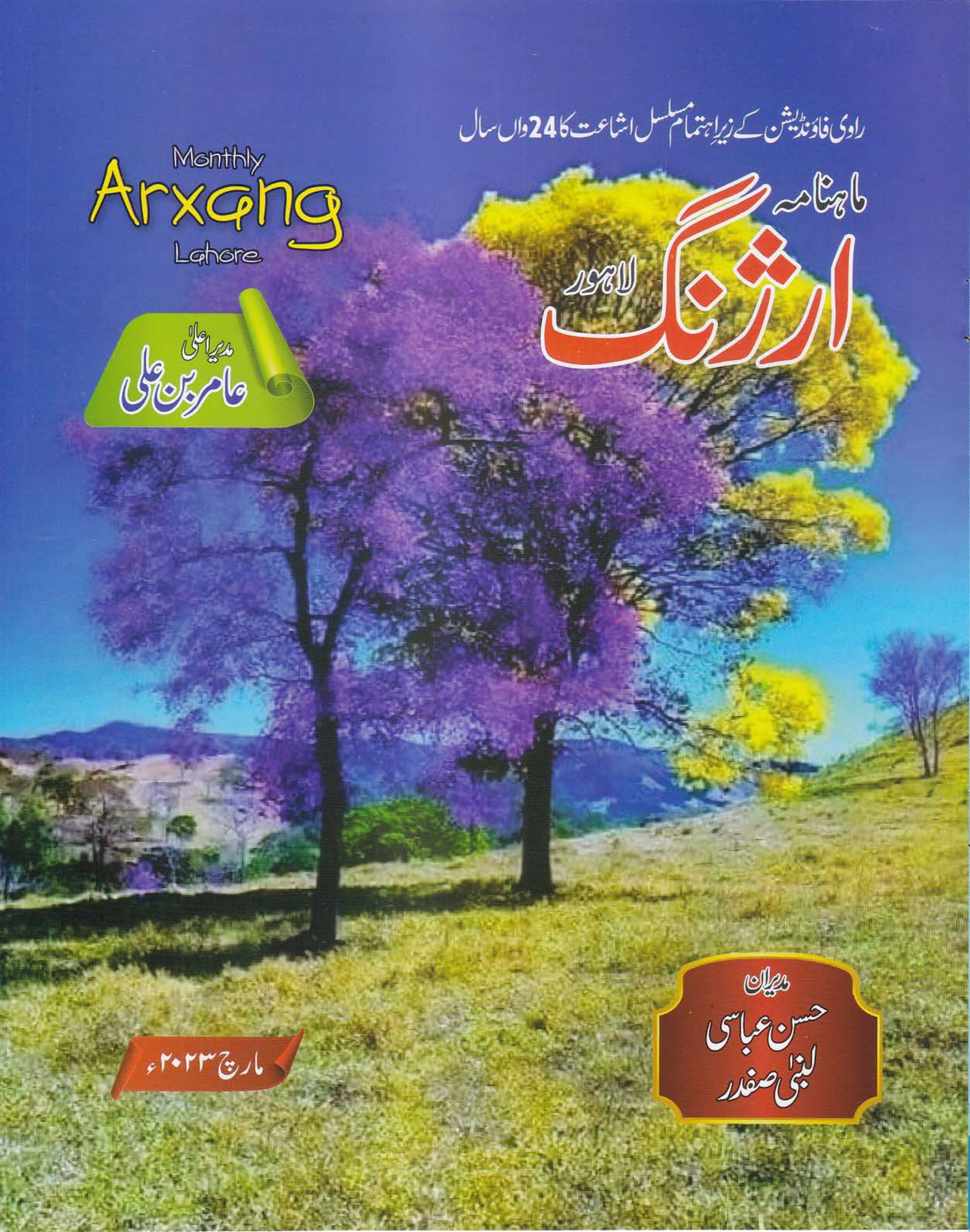

مدیران
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

مارچ ۲۰۲۳ء

KITAB MELA

کتاب میلہ

یہ آخری صدی ہے
کتابوں سے عشق کی

کتاب میلہ پر
70
فیصد
تک ڈسکاؤنٹ

وہ بھی 5000
سے زائد کتب پر

kitabmela.com.pk

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد 24 مارچ 2023ء شمارہ 3

مدیرِ اعلیٰ ◉ عامر بن علی
مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلسِ ادارت}

• ڈاکٹر جعفر حسن مبارک • سعدیہ سیٹھی

{مجلسِ مشاورت}

• ظفر خان (آسٹریلیا) • ارشد نذیر ساحل (چین)

کمپوزنگ • زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر • نعمان حسن: 0333-4918383

سرورق: عمران شناور

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
حسن عباسی: 0300-4489310 نازاوکاڑوی : 0301-4492133
nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ ہر ماہ کاپی باقاعدگی سے بھیجی جائے گی۔
حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت ، 2
مضامین: ○ اقبالؒ اور اصحابِؓ رسولؐ / پروفیسر تفاخر محمود گوندل ، 4
○ امجد اسلام امجد۔محبت کا فلسفی شاعر رخصت ہوا / عامر بن علی ، 10
○ منٹو کا ادبی تشخص / لطیف ساحل ، 12
○ ایک تاریخی غلطی کا ازالہ / کلیم اللہ لاشاری ، 18
○ ہزارے کا ہندکو ادب (ایک جمالی خاکہ) / عبدالوحید بسمل ، 23
○ ترک چاند اور فصلِ بہار / قصیٰ غرشین ، 28
شعری گوشے: جسٹس میاں نذیر اختر، ولی عالم شاہین، لبنیٰ صفدر ، 29 تا 31
افسانے ○ علامات / محمد یوسف وسیر ، 32
○ استقامت / آسناتھ کنول ، 34
○ چوبیس برس بیس گئے / روبنسن سیموئیل گل ، 41
شعری گوشے: زہرا قرار، ثانیہ شیخ ، 43 تا 44
○ اُردو کا DNA / امجد محمود چشتی ، 45
○ "نمک زار" ایک جائزہ / پروفیسر اطہر شاہ نکور یوسفزے ، 47
بقیہ انٹرویو: مشتاق صوفی ، 49
تراجم ○ گالوے کنیل کی نظم "موسموں" کا ترجمہ / قصیٰ غرشین ، 51
شاعری 52 تا 52
رپورٹ ○ انجم آرائی کے نجم "عامر بن علی" / اکمل حنیف ، 54
○ تبصرۂ کتب ، 55
○ نامہ ہائے احباب ، 56

+++++

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo. 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت...... گوشۂ بسمل صابری

تمام خلقتِ گیتی ہے مرتبے میں قبیل
ہر ایک بندۂ خالق کا تو ہی رب جلیل
عطائے خالقِ کونین تیری حکمت ہے
ہر اک نفس کو ملی تیرے فیض کی ترسیل
سکونِ روح بھی تو باعثِ قرار بھی تو
زبانِ شعر و سخن کو ملی ہے فکرِ جمیل
یوں بارگاہِ محبت میں ایسے رنگ کھلے
کہ میرے غنچۂ دل میں جلی ہے اک قندیل
اک اہتمامِ بصیرت ہے یہ نظامِ حیات
عیاں ہے ذوقِ نظارہ بصیرتوں کی دلیل
عطائے خاص تری ہے جو اہلِ زیرک پر
کہ بے نوا بھی بنے ہیں جہاں میں تیرے کفیل
ترے ہی اذن سے پھولوں میں خوشبوئیں مہکیں
کہ آب و گل بھی ہیں جلوہ ہائے ربِ جلیل
ہر اک نفس بھی تو اب حکمِ کردگار میں ہے
ترے سوا تو کوئی بھی نہیں، ہے میرا عدیل
جہانِ عشق و محبت عقیق رنگ ہوا
ملی ہے وصل کو تیرے خلوص کی ترسیل
تری ثنا ہی تو مولا مرا حوالہ ہے
یہی ہے زادِ سفرِ حشر میں اے ربِ جلیل
ہر اک نفس بھی جو سوچوں ترے حصار میں ہے
کرم کی ملتجی بسملؔ کرے ہے تجھ سے اپیل

رحمٰن تو رحیم تو ذوالجلال تو
اُمید کے چمن میں ہے فصلِ وصال تو
ہر ایک راستے پہ رہے تجھ سے رابطہ
میرا شعور میری نظر تو، خیال تو
تجھ کو ہے تیرے رحم کا رحمت کا واسطہ
میں پھر سے گر رہی ہوں جو مجھ کو سنبھال تو
پھیلا رہی ہوں ہاتھ فقط تیرے سامنے
اور صرف جانتا ہے مرے دل کا حال تو
ہر صبح تیرے نام سے کرتی ہوں ابتدا
ہر دستِ شام پر ہے چراغِ جمال تو
عصیاں نہ دیکھ اپنے کرم کی نگاہ کر
تاریکیٔ حیات سے مجھ کو نکال تو
دیکھوں میں جس طرف ترا جلوہ دکھائی دے
ہے تو ہی شرق و غرب جنوب و شمال تو
حسنِ خیال تجھ سے ہے روحِ خیال تو
تیرے سوا ہے کون مرا میری ڈھال تو
آب و گہر میں تو تو کہیں رنگ و نور میں
صبحِ نوا کا سلسلۂ بے مثال تو
بادِ سموم میں کبھی بادِ بہار میں
ان انتہاؤں میں ہے رہِ اعتدال تو
جو کچھ ہے تیرے قبضۂ قدرت میں ہے خدا
بسملؔ کی جاں اگر ہے تو بسمل کا مآل تو

ذرا اک نگاہ تو ڈال دے اے مرے خدا
مجھے ظلمتوں سے نکال دے اے مرے خدا
تو وقارِ قلب و نظر مرا تو رحیم ہے
مرے خال و خد بھی اُجال دے اے مرے خدا
مرا جذبۂ شعر جو آپ کی تحویل میں ہے
مری شاعری کو کمال دے اے مرے خدا
بڑی دیر سے ہوں میں ہاتھ پھیلائے ہوئے
مجھے سیدھے راستے پہ ڈال دے اے مرے خدا
میں ہوں منتظر میری شمعِ فکر میں نور دے
کہ جہاں سارا مثال دے اے مرے خدا
کبھی صبحِ نو سے نواز دے میرے دیدہ ور
مجھے روشنی سے اُجال دے اے مرے خدا
میں تری ثناؤں سے حال اپنا سنوار لوں
مجھے آنے والے وہ سال دے اے مرے خدا
مری دھڑکنوں کی صدا بھی سن لے کسی طرح
مجھے اپنے رنگ میں ڈھال دے اے مرے خدا
نئی رونقوں کی نوید دے مرے جلوہ گر
کوئی ایسے نقش اُچھال دے اے مرے خدا
میری قصرِ جان دمک اُٹھے دے وہ اک ضیاء
مجھے ایسا کوئی جمال دے اے مرے خدا
مرے ہر نوائے سروش کو تو بکھیر دے
مجھے عاقبت کا خیال دے اے مرے خدا
تو جو شہہ رگ سے قریب ہے سنے ہر صدا
مجھے اب نہ کوئی ملال دے اے مرے خدا

ہے لازمی درود مسلسل پڑھا کریں
اس طرح اپنے دکھ کا مداوا کیا کریں
خونِ جگر سے اُن کا لکھیں نام بار بار
طے اس طرح بھی درد کا ہر مرحلہ کریں
صلِ علیٰ وہی ہیں وہی احمدؐ رُسل
منصف ہیں وہ انہی کے سہارے جیا کریں
یہ طے ہے ہر مراد ملے ان کے نام پر
ٹوٹے کبھی نہ رابطہ ان سے دعا کریں
کتنے کٹھن سفر ہوں کوئی معرکہ بھی ہو
عالم میں جذب و شوق کے ہر دم رہا کریں
ڈھارس غمِ حسینؑ ہے اب وجہ زندگی
ہر اک قدم پہ پیرویٔ کربلا کریں
بھیجوں سلام ان پر یہ میری بساط کیا
شامِ فرات آ تجھے آ ہمنوا کریں
آنکھوں میں اشک لے کے چلی اپنی زندگی
بسملؔ تمام حال ذرا عرضِ شاہ کریں

ہو شاداں و فرحاں ، غلامِ محمدؐ
ہو قسمت پہ نازاں غلامِ محمدؐ

نبی پاکؐ کا حق ہے توقیر و عزت
خدا چاہے خود احترامِ محمدؐ

درود انؐ پہ پڑھ کے سلام انؐ کو بھیجو
تمہیں پھر ملے گا سلامِ محمدؐ

سب ایمان لے آئیں دل کی خوشی سے
سمجھ لیں جو انساں پیامِ محمدؐ

رہِ حق پہ قائم وہ رہتا ہے دائم
رہے یاد جس کو پیامِ محمدؐ

غریبوں یتیموں کے غم کا مداوا
ہو قائم جہاں میں نظامِ محمدؐ

تصوف اُٹھا کے شریعت کے پردے
دکھاتا ہے حسنِ نظامِ محمدؐ

ہوائے نفس سے نہیں بولتے وہ
رضائے خدا ہے کلامِ محمدؐ

ہے رنگ کلامِ الٰہی جدا ہی
جداگانہ رنگِ کلامِ محمدؐ

جہاد اُنؐ کی سیرت کا رنگِ حقیقی
یہی ہے حقیقی پیامِ محمدؐ

ہے روضۂ اطہر پہ بہتر خموشی
مرے اشک ہوں ہم کلامِ محمدؐ

تمہیں فکر ہو گی نہ محشر کی اخترؔ
جو بن جاؤ سچے غلامِ محمدؐ

جسٹس (ر) میاں نذیر اخترؔ/لاہور

نہ دل پہ بوجھ رہے گا نہ امتحان میں جان
درود پڑھتے رہو، جب تلک ہے جان میں جان

یہ کس کا نام لیا، روشنی اُترنے لگی
یہ کس کا ذکر چلا، پڑ گئی زبان میں جان

اُٹھانا بوجھ کوئی کم نہیں تھا قرآں کا
نہ تھی زمین میں طاقت، نہ آسمان میں جان

حضورؐ، حرفِ تلطّف کہ بات بن جائے
حضورؐ، بوئے تبسم کہ آئے جان میں جان

کبھی میں نعت پڑھوں اور کبھی سلام سنوں
کبھی دہن میں ہو میرے کبھی ہو کان میں جان

خوشا وہ سانس جو آئے نبیؐ کی یاد لیے
خوشا کہ مجھ سے ہو رخصت نبیؐ کے دھیان میں جان

بس ایک نامؐ سے چلتا ہے کاروبارِ حیات
بس ایک فردؐ سے باقی ہے خاندان میں جان

منیر سیفی (مرحوم)

درودِ پاک سے آغاز کرنا چاہتا ہوں
میں قصرِ نعت کا در باز کرنا چاہتا ہوں

وہ جن کی روضۂ اطہر تلک رسائی ہے
انہی ہواؤں کو ہمراز کرنا چاہتا ہوں

مدینے جانے کی صورت کوئی نکل آئے
میں اس طرح کی تگ و تاز کرنا چاہتا ہوں

جہاں پہ رحمتِ حق کا ظہور ہوتا ہے
انہی فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا ہوں

جو میری نعت کے ہر لفظ کو امر کر دے
وہ سوز شاملِ آواز کرنا چاہتا ہوں

نبیؐ کے نقشِ کفِ پا ہیں جادۂ منزل
انہیؐ کو ہمدم و دمساز کرنا چاہتا ہوں

ثناء کے باب میں خورشید لب کشا ہو کر
سخن کو باعثِ اعزاز کرنا چاہتا ہوں

خورشید بیگ میلسوی (مرحوم)

یہ رونقیں ہیں آپؐ سے، یہ قمقمے ہیں آپؐ سے
خدا قسم خدا کے سارے سلسلے ہیں آپؐ سے

یہ روشنی، یہ چاشنی، یہ زندگی، یہ راگنی
یہ چاندنی ہے آپؐ سے، یہ زمزمے ہیں آپؐ سے

یہ انبیاء، یہ اولیاء، یہ صوفیاء، یہ اتقیاء
یہ سب مقام آپؐ سے، یہ مرتبے ہیں آپؐ سے

یہ عظمتیں، یہ رفعتیں، یہ برکتیں، یہ رحمتیں
یہ حکمتیں ہیں آپؐ سے، یہ معجزے ہیں آپؐ سے

یہ باغباں، یہ آستاں، یہ آسماں، یہ کل جہاں
یہ کوٹھیاں ہیں آپؐ سے، یہ بنگلے ہیں آپؐ سے

امیر کی، غریب کی، فقیر کی، اسیر کی
ضرورتیں ہیں آپؐ سے، معاملے ہیں آپؐ سے

زمیں پہ دھوم آپؐ کی، فلک پہ دھوم آپؐ کی
ہر اک جہاں میں دلفریب تذکرے ہیں آپؐ سے

دکھوں میں جان ہے صمیمؔ کی حضورؐ کچھ کرم
کرم ہے آپؐ سے، کرم کے فیصلے ہیں آپؐ سے

سہیل احمد صمیمؔ/ایبٹ آباد

خُدا عزوجل کی مہربانی ہے ہمیں جو شاد رکھا ہے
ہمارا دِل نبی ﷺ کے ذِکر سے آباد رکھا ہے

عطا کر کے غُلامی سرورِ کونین ﷺ کی ہم کو
زمانے کی غُلامی سے ہمیں آزاد رکھا ہے

مُشامِ جاں معطر ہے مدینے کی فضاؤں سے
حریمِ دِل نبی ﷺ کی یاد سے آباد رکھا ہے

نہاں ہے دھڑکنوں میں آپ کا اِسمِ گرامی ہی
وظیفہ یہ زباں پہ دافعِ اُفتاد رکھا ہے

صُبح سے اس لئے ہے بارشِ انوار میرے گھر
عطائے کبریا عزوجل سے آج جو میلاد رکھا ہے

سراپا پیکرِ رحمت مرے غمخوار آقا ﷺ نے
خُدا عزوجل کے رُوبرو بھی عاصیوں کو یاد رکھا ہے

خُدا عزوجل نے یُوں بڑھائی عظمتِ عشقِ نبیؐ جاوید
نبی ﷺ کا عشق ہی ایمان کی بُنیاد رکھا ہے

جاوید منظور/لاہور

اقبالؒ اور اصحابِ رسولؐ ﷺ - کشتۂ شمعِ رسالت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ

پروفیسر تفاخر محمود گوندل

فضلائے فن اور ماہرینِ اقبالیات کا خیال (جس سے میں بھی بدرجۂ اتم متفق ہوں) ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری القائی اور وہبی قسم کی تھی اور اس حقیقت کا اظہار حضرت علامہ نے خود بھی کیا تھا کہ مجھ پر شعروں کا نزول ہوتا ہے۔ احبابِ اقبال کہتے ہیں کہ نزولِ شعر کے وقت آپؒ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ آمد کا یہ سلسلہ و ملکہ اور عطا وابستگانِ علمِ عروض میں معدودے چند خوش نصیبوں کو مرحمت ہوتا ہے۔ جن خوش مقدر ہستیوں پر یہ عنایتِ ربانی ہوتی ہے میرے نزدیک حضرت علامہ اقبال ان میں سر فہرست ہیں کیوں کہ آپؒ کی شاعری کا زیادہ حصہ وحیِ حق اور فرامینِ رسالت مآبؐ کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ شاید انھی فرمودات کے ساتھ جنون آمیز محبت کا اعجاز و ثمر ہے کہ قسّامِ ازل نے آپؒ کو شعر گوئی کا ایسا نادر الوجود ملکہ عطا فرمایا جس پر اہلِ فن مدتوں رشک کرتے رہیں گے۔ قرآن اور ذاتِ رسولؐ کے ساتھ اقبالؒ کی مجنونانہ محبت و شیفتگی نے آپؒ پر کیف و سرور اور جذب کی ایسی کیفیت طاری کر دی تھی جس کا اظہار ذوقِ تخیل کی گہرائی و گیرائی سے ہی ممکن ہے۔ سطح بین نگاہوں سے فکرِ اقبال کے عمق کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ بعض نظمیں تو واضح طور پر افلاک سے نازل ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایک مغربی مفکر نے جب اقبال سے صاحبِ قرآن حضور ختمی مرتبتؐ پر نزولِ قرآن کے حوالے سے تشکیک کا اظہار کیا تو آپؒ کے چہرے پر جلال کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آپؒ نے برملا ارشاد فرمایا کہ اگر مجھ ایسے پیروکارِ مصطفیؐ پر شعروں کا نزول ہو سکتا ہے تو حضور سرورِ کائناتؐ پر وحیِ حق کا نزول کیسے ممکن نہیں۔ اسی طرح جب جرمن مفکر توحیدِ ربانی کے بارے میں خطا کا شکار ہو کر صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا تو آپؒ نے برجستہ ارشاد فرمایا: ؂

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

حضرت علامہ اقبالؒ نے توحید و رسالت کے بعد وابستگانِ رسالت مآبؐ کا تذکرہ بھی بڑے درد و سوز سے کیا ہے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اور سیدنا امام حسینؓ کے ذکرِ جمیل کے ساتھ ساتھ اسی محبت و وارفتگی سے رفقائے نبوت کے ساتھ بھی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے اور یہ گہرہائے آبدار آپؒ کے فارسی اور اردو کلام میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں جن کا ہم حفظِ مراتب کے اعتبار سے تذکرہ کر رہے ہیں۔ اہلِ بیتِ اطہارؓ کے بعد جن دور رفیع الشان ہستیوں کا تذکرہ علامہ اقبال نے بڑے والہانہ اور سوز و گداز سے کیا ہے، شعر گوئی کی تاریخ میں اس کا جواب ممکن نہیں۔ ایک ''صدیقؓ'' کے عنوان سے اور ایک ''بلالؓ'' کے عنوان سے۔ اگرچہ ''بلالؓ'' کے عنوان سے ایک اور نظم بھی علامہؒ نے لکھی ہے مگر جس نظم کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہم پہلے اس کا تذکرہ کریں گے۔ مگر اس معرکتہ الآرا اور عدیم المثال شعری شہ پارے پر بحث سے قبل فدائے حبیبِ کبریا سیدنا بلالؓ کی عظیم شخصیت اور فداکارانہ کردار کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے پس منظر میں سے متاثر ہو کر اقبالؒ کے قلم نے یہ جواہر آبدار صفحۂ قرطاس پر بکھیرے جو آج تک راہروانِ شوق کے دلوں کو منور کر رہے ہیں اور جس کا ایک ایک لفظ لعلِ یمن سے فزوں تر ہے۔

سیدنا بلالؓ ایک سیاہ فام حبشی غلام تھے۔ آپؓ طویل القامت اور ظاہری خدوخال کے اعتبار سے جوانِ رعنا نہیں تھے۔ نقش و نگار میں کوئی جاذبیت نہیں تھی مگر دل ایمان کی حرارت سے جگمگا رہا تھا۔ اگرچہ جسم بظاہر لاغر معلوم ہوتا تھا مگر قبولِ اسلام کے بعد رزمِ حق و باطل میں وہ فولاد کی طرح مضبوط بن گیا تھا۔ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم رہنے والا یہ حبشی غلام جبر و استبدادِ اُمیہ بن خلف کے سامنے لوہے کا چنا ثابت ہوا۔ ایک بار حضورؐ اپنے رفیقِ خاص سیدنا صدیقِ اکبرؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ بلال قریب سے گزرے، حضورؐ نے اس بظاہر سیاہ فام حبشی (مگر جس کے دل کی تابش ماہتاب کو بھی شرما رہی تھی) کو بلا کر ارشاد فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں اور اسلام اس کا سچا دین ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟ نجیب النفس بلال نے کہا: مجھے آپؐ کا ارشاد درست معلوم ہوتا ہے۔ بلال نے جواباً قبولِ اسلام کے لیے آمادگی کا اظہار تو نہیں کیا اور واپس آ گئے مگر اپنا نقدِ دل بارگاہِ محمد عربی ﷺ میں ہار آئے۔ شام تک بے قراری اور تذبذب سے کروٹیں بدلتے رہے اور غیر مرئی چاہت و محبت سے طبیعت میں بے چینی سی محسوس کرتے رہے۔ ایک انجانی سی کشش بارگاہِ رسالت مآبؐ کی طرف کھینچتی رہی۔ جمالِ مصطفیؐ کی رعنائی و زیبائی نے بے خودی کی ایسی دلفریب کیفیت پیدا کر دی جس نے آپؓ کو کشاں کشاں بارگاہِ نبوتؐ میں پہنچا دیا۔ حضرت بلالؓ کو یقیناً قبولِ حق کی پاداش میں جور و جفا اور عالمِ کفر کی بہیمیت کا احساس تو ہو گا مگر جو دل اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ ؂

مقامش عبدهٔ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

وہ دل کب ستم گرانِ کفر کو خاطر میں لاتا ہے۔ جس کو حضورؐ کی زلفِ عنبریں کا سایا نصیب ہو جائے وہ بھلا اُمیہ بن خلف کی بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلوں کو کیا سمجھتا ہے جو اس ایمان افروز حقیقت کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور اپنا ایمان و ایقان سمجھ رہا ہو۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

تُو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
وگرنہ جز تو ما را منزلِ نیست

وہ جبر و استبداد اُیہ بھلا کس طرح خاطر میں لائے گا۔ یقیناً عالمِ کفر کے بھڑکائے ہوئے شعلۂ استبدادیت کی جاں سوز تمازت کا اس غلام محمدِ عربی ﷺ کو احساس تو ہوگا اور یہ حقیقت بھی آپؓ کو از بر ہوگی کہ منکرینِ حق کی بھڑکائی ہوئی شمشان بھومی میں کشتگانِ خنجرِ تسلیم کس طرح دن رات جل رہے ہیں مگر ان کے پائے ثبات میں جنبش پیدا نہیں ہو رہی۔ اور اس مکتبِ عشق میں قدم رکھنے سے وہ دن بھی دیکھنا پڑتے ہیں جن کے تصور سے حیات کانپ اٹھتی ہے۔ سیدنا بلالؓ کے پیشِ نظر یہ ابدی حقیقت بھی تھی کہ مکتبِ عشق میں داخل ہوتے وقت فکرِ سود و زیاں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور بتانِ وہم و گماں سے کنارا کشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس مکتبۂ فکر میں تو وہ ہے جہاں ''بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد'' والا معاملہ ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے سیدنا بلالؓ کے ساتھ جس والہانہ وارفتگی و عقیدت کا اظہار کیا ہے اس پر بحث سے قبل آپؓ کا ایک اجمالی تعارف پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ معتبر ترین روایات کے مطابق آپؓ کا نام بلال اور کنیت ابوعبداللہ تھی۔ آپؓ کے والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ آپؓ کے آباؤ اجداد حبشی النسل تھے۔ سیدنا بلالؓ مکۃ المکرمہ پیدا ہوئے، نحیف و نزار جسم، طویل القامت، رنگ سیاہ گندمی، سر کے بال گھنے اور خم دار تھے۔ آپؓ کے بالوں کی انھی پیچ و خم میں عشقِ رسولؐ کی تابش جھلک رہی تھی۔ آپؓ ایک ترش رُو اور سنگ دل انسان امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اس نے بکریاں چرانے کا کام آپ کے سپرد کر رکھا تھا۔ امیہ بن خلف اسلام کے بدترین دشمنوں میں شمار ہوتا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضورؐ کے اعلانِ نبوت کے بعد اہلِ ایمان پر عالمِ کفر نے جبر و ستم کا ایک طوفانِ بدتمیزی بپا کر رکھا تھا۔ وحشت و بربریت اور جور و جفا کے اس عروج پر سیدنا بلالؓ کا قلادۂ غلامیِ مصطفیٰؐ زیبِ گلو کرنا آسان کام نہیں تھا مگر ازاں ازل سے جس کے عشق کا ترانہ بن چکی ہو وہ ان جاں گسل مصائب و آلام کو بھلا کیسے خاطر میں لاتا ہے۔ آپؓ کے دل و جان جمالِ محمدؐ کے اسیر بن چکے تھے۔ رگ رگ میں اللہ کی وحدت کا سرور رچ بس گیا تھا۔ حضورؐ کے ایک اشارۂ ابرو پر آپؓ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ آپؓ کے دل میں جب شعلۂ حق بھڑکا تو اس کی لَو کی حدت آپؓ کے آقا امیہ تک بھی پہنچ گئی۔ بس پھر کیا تھا وہ پیکرِ استبدادیت آتش زیر پا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا کہ میرے ایک حبشی النسل غلام کی یہ جرأت کہ وہ اس قافلے کا حصہ بن جائے جو ہمارے آباؤ اجداد کے عقائد کو باطل ثابت کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو۔ جسدِ بلال اُمیہ کی وحشت و بربریت کا تختۂ مشق بن گیا۔ وہ کون سی اذیت تھی جو اس غلامِ خدا و مصطفیٰؐ کو نہ دی گئی۔ اس ظالم و جابر نے آپؓ کو کلمۂ حق ترک کر دینے کے لیے جو اندازِ تشدد اپنایا اس سے تو چشمِ فلک بھی خونابہ فشاں ہو جاتی ہوگی۔ قبولِ اسلام کے ''جرم'' کی پاداش میں آپؓ کو بہیمانہ اور وحشیانہ طریقے اپنائے گئے ان کو رقم کرتے ہوئے تو اہلِ سیر بھی کانپ کانپ اٹھتے ہوں گے۔ اُمیہ آپؓ کو تانبے کی طرح تپتے ہوئے ریگ زار پر لٹا دیتا اور اسی حالت میں آپؓ کے اس جسمِ اطہر پر بھاری پتھر رکھ دیتا جس کے بال بال سے اللہ کی کبریائی کی صدا گونجتی تھی۔ جب پھر بھی آپؓ اعلائے کلمۃ اللہ سے باز نہ آتے اور دستِ جبر کی ہر ضرب پر احد احد پکارتے تو وہ انھیں دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیتا جس سے آپؓ کے جسمِ اطہر کی چربی پگھل پگھل کر کوئلوں کو بجھا دیتی مگر آپؓ متواتر زبانِ حق فشاں سے نغمۂ توحید کی صدا بلند کرتے رہے۔ آپؓ کی یہ غایتِ جرأتِ رندانہ دیکھ کر وہ اور چراغ پا ہو جاتا کہ محمد عربی ﷺ کے لائے ہوئے فلسفۂ توحید میں وہ کیا لطافت و لذت اور کشش و جاذبیت ہے جو بلال کو اتنے جاں سوز مظالم کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہونے دے رہی۔ اس جذبۂ عشق میں وہ کیا حلاوت و مٹھاس ہے جس کی لذت فقط میرا غلام بلال محسوس کر رہا ہے مجھے نظر نہیں آتی، وہ مے خانۂ سرور ہے جس سے جام پی کر اس حبشی نژاد پر سرمستی کی عجیب کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ اس نے مغلوب الغضب ہو کر نوجوان آوارگانِ شہر کو بلایا اور آپؓ کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے ان کے حوالے کر دیا کہ اس ''ضدی اور ڈھیٹ'' حق پرست کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جس کی ہولناکیوں کی تاب نہ لا کر یہ دوبارا ''راہِ راست'' پر آ جائے۔ مکّہ کے وہ آوارہ گرد نوجوان نشے میں دُھت، اہلِ ایمان کی بزمِ وفا کے اس صدر نشین کے گلے میں رسی ڈال کر مکہ کی گلیوں میں گھسیٹے پھرتے، تالیاں پیٹتے اور مغلظات بکتے، آپؓ کی تشنہ لبی کا مذاق اڑاتے، آپؓ کے ان گالوں پر طمانچے رسید کرتے جو نورِ محمدیؐ کی تابش سے دمک رہے تھے۔ آپؓ کے سینے میں طلوعِ نورِ سحر کی امید جگمگا رہی تھی۔ سیدنا بلالؓ کو اوندھے منہ لٹا کر بڑے بڑے

بھاری پتھر رکھ دیے جاتے مگر مجال ہے کہ بظاہر اس سیاہ فام مگر اندر سے رخشندہ و تابندہ تر وارفتۂ توحید کے پائے استقلال میں معمولی سی جنبش بھی ہوئی ہو۔ یہ بندگانِ جور و جفا اس حقیقت سے نابلد تھے کہ جاں سپارانِ حبیبِ کبریاؐ کو اگر تماشا گاہِ دار و رسن میں سولی پر بھی لٹکا دیا جائے تو وہ بصد فخر و مباہات اُچھلتے کودتے نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس شان سے مسکراتے ہیں کہ خود موت کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں۔ عالمِ کفر کی یہ بربریت تسلسل سے جاری رہی۔ ایک روز مزاج شناسِ نبوت سیدنا صدیقِ اکبرؓ کا گزر اس منطقۂ ستم کی طرف ہوا جہاں حق گوئی کی پاداش میں سیدنا بلالؓ کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ یہ وحشیانہ تشدد دیکھ کر صدیقِ اکبرؓ کے گوشہ ہائے چشم سے آنسو ڈھلک پڑے۔ آپؓ کی شانِ فیاضی و استغنا جوش میں آ گئی۔ آپؓ نے فوراً امیہ کو پرکشش پیش کش کی کہ میرے پاس ایک خوب صورت خدوخال والا، خوب رُو طویل القامت غلام موجود ہے، وہ تم لے لو اور منہ مانگی رقم کے عوض یہ سیاہ فام حبشی غلام مجھے دے دو۔ اُمیہ نے یہ دل فریب پیشکش قبول کر لی اور سیدنا بلالؓ کو صدیقِ اکبرؓ کے حوالے کر دیا۔ آپؓ نے فوراً سیدنا بلالؓ کو آزاد کر دیا۔ یہ صاحبِ صدق و صفا، پیکرِ مہر و وفا، ایک عجیب احساسِ تفاخر و مسرت سے زخموں سے چُور سیدھے بارگاہِ مصطفویؐ میں پہنچے۔ یہ شانِ فداکاری دیکھ کر حضورؐ کی آنکھوں سے مسرت و ابتہاج کے آنسو ڈھلک پڑے۔ سیدنا بلالؓ ایک بے سر و پا اور نادار و مفلوک الحال انسان تھے۔ آپؓ کے پاس نہ رہنے کے لیے مکان نہ مال و متاعِ دنیوی۔ بس لے دے کے اک متاعِ عشقِ رسولؐ تھی جس نے بلالؓ کو ہم دوشِ افلاک کر رکھا تھا۔ اسی دولتِ حُبِ رسولؐ نے دنیا و مافیہا کی تعیشات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ڈاکٹر عابد نظامی مرحوم نے اس کیفیت کا نقشہ کتنے خوب صورت انداز میں کھینچا ہے:

اک عشقِ مصطفیٰؐ ہے اگر ہو سکے نصیب
ورنہ دھرا ہی کیا ہے جہانِ خراب میں

حضرت بلالؓ، سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی عدیم النظیر شانِ فیاضی کی بدولت، امیہ بن خلف کے قاہرانہ جبروت کے سلاسل سے آزاد ہو کر بارگاہِ رسالت مآبؐ میں ایسے حاضر ہوئے کہ پھر وصالِ مصطفیٰؐ تک ایک لحظے کے لیے بھی جدا نہیں ہوئے۔ آپؓ کو غلامیٔ رسولؐ میں وہ لذت و لطافت حاصل ہوئی جس کا اظہار کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر و صاحبِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ سنگِ درِ حبیبِ کبریاؐ کی بوسہ زنی آپ کا لازمۂ حیات بن گئی۔ اگر حضور سیدِ دو عالمؐ گھر میں تشریف فرما ہوتے تو آپؓ درِ اقدس پر پڑے رہتے اور ایک بے تابانہ اشتیاق کے ساتھ انتظار کرتے کہ کب لکّہ ابرِ کرم نمودار ہو گا اور نہاں خانۂ دل جگمگا اٹھے گا اور آنکھوں کو روشنی اور ذہن کو بالیدگی عطا ہو گی۔ جب سرورِ قلب و جاںؐ باہر تشریف لاتے تو آپؓ پیچھے پیچھے نقشِ پائے مصطفیٰؐ کو چومتے جاتے۔ حضرت علامہ اقبال نے اسی سوز و سرور میں کہا ہو گا:

بیا، اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تُو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادے دل بگوئیم
بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

یتیموں کے والی اور غلاموں کے ملجا و ماویٰ حضور سیدِ دو عالمؐ نے تالیفِ قلبِ بلالؓ کی خاطر آپؓ کو اپنے گھر کا خزانچی مقرر فرما دیا اور اخراجات کا صادق و امین بنا دیا۔ اخراجات کا محاسب اسی کو بنایا جاتا ہے جس پر انتہا درجے کا اعتماد ہو۔ اس اعتبار سے سیدنا بلالؓ، اپنے آقاؐ کا مرکزِ نگاہ بن گئے۔ اتنی قربت و شفقتِ مصطفیٰؐ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئی ہو اور یہ قربت و اعتماد ان انتہاؤں کو چھونے لگا کہ آپؐ نے فرما دیا کہ اگر بلال میرے بارے میں یہ کہہ دے کہ آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے تو یقین کر لیا کرو۔ اس سے بڑا قابلِ رشک مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بلالؓ وہ شخص ہے جس کا جنت انتظار کرتی ہے۔ ایک بار حضورؐ نے فجر کی نماز کے بعد اپنے غلامِ صادق سے فرمایا کہ میں نے رات کو خواب میں جنت میں داخل ہوتے وقت اپنے آگے تمھارے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے تمھیں یہ فضیلت حاصل ہوئی ہے؟ بلالؓ نے دست بستہ عرض کیا: یا رسول اللہؐ! جب بھی وضو ٹوٹتا ہے تو وضو کے بعد ہر مرتبہ دو رکعت نماز پڑھتا ہوں۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد آپؓ حضرت سعد بن حثیمہ کے مہمان بنے مگر مواخاۃ میں حضورؐ نے سیدنا بلالؓ کو حضرت رد یحہؓ کا بھائی بنایا۔ تعمیرِ مسجدِ نبوی کے بعد سیدنا بلالؓ کو پہلا مؤذنِ اسلام ہونے کا اعزاز بخشا گیا اور پھر قیامت تک اذانِ بلالی ایک ایمان افروز حقیقت آگیں استعارا بن گئی۔ نماز باجماعت سے قبل اذان کہنا تو ویسے ہی لازم و واجب ہے اور حصولِ ثواب کا بہت بڑا ذریعہ بھی مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر مؤذن اسے سنتِ بلالی سمجھ کر بھی ادا کرتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ فدایانِ رسولِ مکرمؐ ایسے بھی تھے جو بے سر و سامان تھے اور ارکانِ اسلام کی بجا آوری اور زیارتِ محمدِ عربی ﷺ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، انھیں عرفِ عام میں اصحابِ صفہؓ کہا جاتا ہے۔ ان میں سیدنا بلالؓ بھی شامل تھے۔ پہلے معرکۂ حق و باطل غزوۂ بدر کے موقع پر سیدنا بلالؓ بھی شامل ہوئے اور انھیں

اپنے بدترین دشمن امیہ بن خلف کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کا موقع ملا یوں آپؓ کو اس کے ڈھائے ہوئے خوف ناک اور بہیمانہ ستم کا بدلہ لینے کا موقع ملا۔ حضورؐ سرورِ کائناتؐ کی، حضرت بلالؓ کے ساتھ شفقت و مؤدت کا عالم یہ تھا کہ ایک بار ایک صحابی نے ازراہِ تفنن وطنز حضرت بلالؓ کو حبشی عورت کا بیٹا کہہ دیا۔ حضورؐ کے چہرۂ انور پر کبیدگی اور ناگواری کے اثرات نمودار ہو گئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم اب بھی زمانۂ جاہلیت کی باتیں کرتے ہو؟ حضرت بلالؓ کو ایک منفرد شرف و امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر آپؓ نے رسول اللہ کے حکم پر پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ وہ کیسا کیف آفریں لمحہ ہوگا جب اسی شہرِ مکہ میں ضرباتِ جبر و استبدادِ کفر سہنے والا ایک وارفتۂ توحید و غلامِ مصطفیٰؐ، کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ کی کبریائی کا ڈنکا بجا رہا ہوگا اور اس کی محبوب ذات بھی پاس ہی جلوہ افروز تھی۔

جب حضور سرورِ کائناتؐ اس عالمِ رنگ و بُو سے پردہ فرما گئے تو رنجِ فراقِ مصطفیٰؐ سے حضرت بلالؓ کی حالت غیر ہوگئی۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ آپؓ اذان کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئے۔ خاص طور پر جب اشہد ان محمد رسول اللہ کی صدا بلند کرتے تو آپؓ پر رقت طاری ہو جاتی اور ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ جاتے۔ جب آقا کریمؐ کا روئے درخشاں نظر نہیں آتا تھا تو اضطراب و بے قراری حد سے بڑھ جاتی۔ اسی وجہ سے آپؓ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر ملک شام میں جا بسے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جو آنکھیں صبح و مسا دیدارِ حبیبِ کبریاؐ کی عادی ہو چکی تھیں ان سے اب ہجر کے یہ جاں گداز لمحے برداشت نہیں ہو پا رہے تھے۔ دمشق میں قیام کے دوران ایک رات عالمِ رویا میں آپؓ کو حضور سرورِ کائناتؐ کی زیارت ہوئی، آپؐ نے اپنے عاشقِ صادق کو مخاطب ہو کر فرمایا! بلال! تم نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ آپؓ اُسی وقت انتہائے بے قراری میں آنسوؤں کے بہاؤ میں مدینہ طیبہ کی جانب چل دیے۔ جب حسنین کریمینؓ نے آپؓ کو مسجد نبوی میں دیکھا تو ان سے اذان کی فرمائش کی۔ آپؓ اپنے محبوبؐ کے نواسوں کی فرمائش ٹال نہ سکے اور مجبوراً اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جب آپؓ اشہدان محمد رسول اللہ کی صدا بلند کرنے لگے تو فرطِ حزن و غم سے بے ہوش ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ کو بھی یارائے ضبط نہ رہا وہ بھی دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے ایک اردو نظم میں کسی اور صحابی کے حوالے سے اس کیفیت کا نقشہ کتنے خوب صورت انداز میں کھینچا ہے۔

بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک پل کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

سیدنا بلالؓ نے چند دن مدینہ منورہ میں قیام فرمایا مگر پھر جب آقا کا روئے تاباں نظر نہ آتا تو تڑپ تڑپ اٹھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حریمِ محبت کے قرینوں سے بلالؓ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا۔ لوگ دنیاوی محبوبوں کا فراق برداشت نہیں کر سکتے مگر یہ معاملہ تو محبوبِ خداؐ کا تھا۔ اس جدائی کی کیفیت سے بلالؓ کے لیے تو دنیا بھر کے فصحاء کے قلم سرنگوں نظر آتے ہیں۔ یہ اذان حضرت بلالؓ کی آخری اذان تھی۔ آپؓ پر سینے میں طوفانِ اندوہ و غم لیے واپس دمشق تشریف لے گئے اور باقی زندگی اسی عالمِ بے قراری میں گزار دی۔ اب آپؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپؓ کی اہلیہ نے کہا: ہائے کتنا غم انگیز موقع ہے۔ آپؓ نے فوراً ارشاد فرمایا: غم انگیز نہیں مسرت انگیز موقع ہے کیوں کہ میری روح چند لمحوں کے بعد روحِ محبوبؐ سے جا ملے گی۔ وفات کے بعد آپؓ دمشق میں باب الصغیر کے قریب دفن ہوئے۔

عشاقِ رسولؐ وہاں قیامت تک حاضری دے کر غلامِ مصطفیٰؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت کرتے رہیں گے۔ جب آپؓ کی وفات ہوئی تو یہ دوسرے خلیفۂ راشد سیدنا فاروقِ اعظمؓ کا دورِ خلافت تھا۔ جب سیدنا عمرِ فاروقؓ کو حضرت بلالؓ کی وفات کا پتا چلا تو سیدنا فاروقِ اعظمؓ جیسا مضبوط اعصاب کا مالک اور صاحبِ جلال و سطوت بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بے ساختہ آپؓ کی زبان سے نکلا آہ! آج ہمارا سردار بلالؓ بھی بچھڑ گیا۔ سیدنا بلالؓ کے دو اعزاز ایسے تھے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ ایک تو آپؓ حضورؐ کے ذاتی خزانچی بھی تھے اور امام المؤذنین بھی تھے۔ دوسرے یہ کہ آپؓ کو مسجدِ نبوی، مسجد الاقصیٰ اور بیت اللہ شریف، تینوں محترم و محتشم جگہوں پر اذان دینے کا شرف حاصل ہے۔

علامہ اقبالؒ نے آپؓ کی خدمت میں جو لامثال و بے عدیل خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کے متعلق میرا ایمان یہ ہے کہ ایسا حیات بخش، محبت و کیف آفریں اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہدیۂ تحسین دنیا کے کسی اور شاعر کے بس کی بات نہیں۔ سوچتا ہوں کہ وہ کون سا تابش انگیز لمحہ ہوگا جب حضرت علامہؒ کی کلکِ صدف بار جنبش میں آئی ہوگی اور اس نے وہ جواہرِ آب دار قرطاس پر اگل دیے ہوں گے جن کی چمک چشمِ اہلِ ایمان کو خیرہ کر رہی ہے۔

قارئینِ کرام! آئیں ذرا فداکارِ مصطفیٰؐ، حضرت علامہ اقبالؒ کی اُس نظم سے حظ اٹھائیں جس کے الفاظ مہ و مہر اور انجمِ افلاک کی عظمتوں سے بھی بڑھ کر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

چمک اٹھا جو ستارا ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا
اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو وہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپیدو دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اُس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

قارئینِ کرام! اس رفیع الشان اور معرکتہ الآرا نظم کے ایک ایک شعر کے ایک ایک لفظ پر دنیائے علم و ادب کی تمام فصاحتیں اور بلاغتیں قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ جو لوگ شاعری میں موجود غنا و موسیقیت سے آگہی رکھتے ہیں وہی اس نظم کے کیف و کم کو صحیح طور پر جانتے اور پہچانتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اپنے محسوسات بیان کیے دیتا ہوں۔ میں اُس وقت آٹھویں کلاس کا متعلم تھا جب پہلی مرتبہ قبلہ والد صاحبؒ مغفور کی آواز میں مترنم صورت میں یہ شہرۂ آفاق نظم سنی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت ابا جی کے پاس قبلہ ماموں جانؒ بھی فروکش تھے اور غالباً اُنھی کی فرمائش پر یہ کیف آفریں اشعار سنائے گئے تھے۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دونوں بزرگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ چوں کہ محترم ماموں جانؒ اقبالیات پر بھی کامل عبور رکھتے تھے اس لیے ان کی کیفیت ادراک واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ نجانے اُس وقت درویشِ لاہوری کے قلب وذہن کی کیا کیفیت ہو گی اور انھوں نے فداکارِ حبیبِ کبریا (بلالؓ) کے حضور نذرانۂ عقیدت کے لیے شہ پر جبریلؑ کی جھنکار کی طلب کی ہو گی اور فیاضیٔ قدرت نے وہ فوراً ارزانی کر دی ہو گی۔ اگر چہ حضرت علامہؒ کا سارا کلام ہی افلاک سے اترتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس نظم سے عشق و محبت، خلوص و ایثار اور وارفتگی و شیفتگی کے جو سوتے پھوٹتے ہیں، تاریخ عروض میں اس کی مثال ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ذرا اس شعر میں پوشیدہ لطافت کا جائزہ لیجیے مجھے تو اس کے اظہار کے لیے اپنا قلم عاجز نظر آتا ہے ؎

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

اس شعر کا دوسرا مصرعہ عشاقِ مصطفیٰﷺ کے تن بدن میں بجلیاں بھر دیتا ہے یعنی اس کائنات رنگ و بُو میں فقط روئے محمدِ عربی ﷺ ہی ایسا جمال افروز ہے جس کو صبح و مسا زیارت کرنے کے باوجود بھی سیری نہیں ہوتی اور زیارت کرنے والی چشمِ بلالؓ ہو تو اس پُرسوز کیفیت کو کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی تڑپا دینے والے تصور کو اسی نظم کا ایک اور مصرعہ بھی فروغ دے رہا ہے ؎

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپیدو دمِ نیا سائید

واہ مولوی سید میر حسنؒ کے شاگردِ رشید! تیرے قلم کی عظمت و رفعت، فصاحت و بلاغت اور جامعیت و سلاست پر قربان ہونے کو جی چاہ رہا ہے۔ اے کاش! جب حضرت علامہ اقبالؒ یہ نظم ''بلالؓ'' صفحۂ قرطاس پر یہ جوہر آبدار اُگل رہے تھے مجھ ایسا عقیدت مندِ اقبالؒ پاس موجود ہوتا تو آستانِ کلکِ اقبال پر بار بار بوسہ زنی کرتا۔ اس کمالِ فن پر کئی مرتبہ نثار ہونے کو جی چاہتا ہے۔ رفعتِ تخیل، زورِ بیان، موسیقیت و غنائیت، سوز و گداز اور وجد آفرینی کے اعتبار سے یہ نظم اپنی مثال آپ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اک موجِ سلسبیل رگ و پے میں ڈھلتی جا رہی ہے اور جیسے شبنم کے جھروکوں سے آفتاب کی کرنیں جھانک رہی ہوں، جیسے محفلِ انجم بوقلمونی حیات کو جذب باہم کا درس دے رہی ہو، جیسے نسیمِ صبح کے جانفزا جھونکے رحمتِ پروردگار کی آمد کا پتا دیتے ہوں، جیسے چمن زارِ محبت میں ذوقِ دید، لطفِ تمنا کو اپنے دامن میں سجائے دعوتِ نظارا دے رہا ہو۔ غرض اس نظم میں پوشیدہ خصائص و کمالات حضرت علامہ اقبالؒ کے فنی محاسن کے ارتفاع کا پتا دیتے ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ ''بانگِ درا'' میں ہی موجود ایک اور نظم میں (جو بلالؓ کے عنوان سے ہی ہے) مقام و مرتبۂ بلالؓ پر اپنے مخصوص انداز میں خامہ فرسائی فرماتے ہیں اور سکندرِ رومی کے جاہ و جلال، شوکت و سطوت اور تاج و تخت و حکومت اور دوسری طرف ایک خاک نشین حبشی زادہ غلامِ مصطفیٰﷺ، بلالؓ کی، اللہ اور اس کے حبیبﷺ کی بارگاہِ اقدس پناہ میں عزوشرف اور مقام کا تقابل پیش کرتے ہیں۔ اگر چہ از روئے تیقن و ایمان تو یہ تقابل محلِ نظر ہے اور بظاہر مناسب معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، مگر حضرت علامہ اقبالؒ کے اظہارِ خیال کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

اور

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی

پہلے بند میں ترجمانِ حقیقت و معرفت حضرت علامہ اقبالؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ سکندر رومی ایسی جاہ و حشمت والا حکمران جس کی شہامت کی نظیر اس چرخِ نیلی فام کے نیچے کہیں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے سپاہ کے گھوڑوں کے سموں سے جبروت و جلال کی وجہ سے آگ نکلتی تھی۔ اس کی انانیت و کبریائی کے سامنے دارا و پورس کا مقام فروتر نظر آتا تھا۔ اس کے اس مقامِ نخوت و رعونت کو چشمِ فلک حیرت و استعجاب سے دیکھتی۔ جب وہ پورے جاہ و حشم اور احساسِ غرور و تمکنت سے چلتا تو سمجھتا کہ تمام عالمِ اشیا اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اس کے مقابلے میں مجسمۂ خلوص و وفا، پیکرِ عجز و انکسار، سراپا مسکنت و نجابت، خوئے دلنوازی و جذبۂ محبتِ رسولؐ میں سرشار حضرت بلال حبشیؓ کی عظمت و رفعت، سربلندی و تکریم دیکھیے کہ عشقِ رسولِ خدا میں غایت کی وجہ سے ان کا نام جبینِ افلاک پر مثلِ مہ و نجوم جگمگا رہا ہے۔ قیامت تک صاحبانِ فصاحت و بلاغت ان کی داستانِ الفتِ رسولِ معظمؐ سعادتاً اہلِ دل کو سناتے رہیں گے اور اس حسنِ ابلاغ کو اپنے لیے توشۂ آخرت گردانتے رہیں گے۔ جہاں بھی اور جب بھی جاں سپاران و فدایانِ توحید و رسالت کا ذکرِ خیر ہوگا، سیدنا بلالؓ کا تذکرۂ جمیلہ سرِ فہرست ہوتا نظر آئے گا۔ جب بھی مظلوم و مقہور، بے بس و بے یار و مددگار شہرِ مکّہ کے حق پرستوں پر اہلِ جبروت و نخوت کا ظلم و ستم حوالے کے طور پر آئے گا نورِ ایمان و یقین سے مستنیر جثہ کے سیاہ فام غلام آقائے گیتی پناہ (بلالؓ) کا ذکرِ تاباں نجاتِ دنیوی و اُخروی کا ضامن سمجھا جائے گا۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایک جاہ پرست اور فرعون فطرت بادشاہ، سکندر رومی کا آج کوئی نام لیوا باقی نہیں۔ اگر اس کا نام لیا بھی جاتا ہے تو نفرت آمیز طریقے سے۔ تربتِ سکندر اگر کہیں ہے بھی تو ویرانی و پریشانی اور حزن و ملال کی آماج گاہ بنی ہوگی مگر اہلِ ایمان سیاحین گھر سے نکلتے وقت سیدنا بلالؓ کی لحد کی زیارت کی تمنا لیے آتے ہیں۔ آیئے! ذرا حضرت علامہ اقبالؒ کی وہ نظم پڑھنے کی سعادت حاصل کریں جس میں اہلِ قلب و نظر کے لیے ایک ایمان افروز سبق پوشیدہ ہے۔؎

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے
اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولاں گہ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تر اُس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشہِ انجم سپاہ کو
حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلالؓ، وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ
محکوم اس صدا کے شہنشاہ اور فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر
اقبالؔ! کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشیؓ کو دوام ہے

دوسرے بند میں حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا بلالؓ کی وجہِ عزت و عظمت اور شہرت جذبۂ محبتِ مصطفیٰؐ تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اذان تھی جو امیر و غریب اور اسود و احمر میں خوئے اختلاط پیدا کرتی تھی جس کا سوز و گداز آج بھی قلب و جگرِ چرخِ کبود میں لذت پیدا کر رہا ہے اور دنیا بھر کے تاجور اور گدا لحنِ بلالیؓ کے محکوم نظر آتے ہیں۔ آخری شعر میں حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اے اقبال! حضرت بلالؓ کی تمام رفقائے نبوت میں وجہِ امتیاز کیا ہے اور جس امتیاز نے رفعتِ افلاک سے بلند کر دیا۔ بلاشبہ یہ فیضِ عام منبعِ رشد و ہدایت، مخزن و معدنِ صراطِ مستقیم حضور سیدالمرسلینؐ کی دل پذیر و حیات بخش محبت و رفاقت کا اعجاز و ثمر ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ شاید اسی اذان و لحنِ بلالیؓ کی تلاش میں یورپ و فلسطین کے دورے پر تشریف لے گئے تو وہ جستجویانہ نظروں سے متلاشی ہوں گے اور بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے؎

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

حضرت علامہ اقبالؒ کی معروف طویل نظم ’’شکوہ‘‘ میں بھی ایک بند کے آخر میں حضرت بلالؓ کی مقدس زندگی کا تذکرہ فرماتے ہیں اور بارگاہِ رب العزت پناہ میں فریاد و شکوہ کناں ہے کہ ابھی تک مسلمانوں کے سینوں میں اپنے اسلاف کا جذبہ مرا نہیں ہنوز زندہ ہے اور فرماتے ہیں جس طرح آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں کے سامنے حضرت بلالؓ مجاہدانہ عزم سے ڈٹے رہے اور ان کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آئی اسی طرح ہم بھی عالمِ طاغوت کے سامنے نعرۂ تکبیر بلند کرنے کی طاقت و ہمت رکھتے ہیں:

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالؓ حبشی رکھتے ہیں

امجد اسلام امجد۔محبت کا فلسفی شاعر رُخصت ہوا

عامر بن علی/جاپان

کبھی گمان میں بھی نہ تھا کہ موت ایسے زندہ آدمی کو بھی ہم سے چھین کر لے جائے گی۔محبت کی نظمیں کہنے والے امجد اسلام امجد اب ہم میں نہیں رہے۔یہ خبر دل ودماغ پر بجلی بن کر گری ہے۔ابھی چند دن پہلے انہیں مسجد نبوی کے صحن میں سبز گنبد کے پاس نبی اکرمؐ کی نعتیں سناتے دیکھا گیا۔زندگی اور خلوص سے بھری مسکراہٹ والے امجد اسلام امجد جس محبت کا پرچار اپنے شعروسخن میں کرتے تھے خود بھی اس چاہت وخلوص کا پیہم اور عملی نمونہ تھے۔ان کی شخصیت کے کئی رنگ اور پہلو تھے۔مگر ہر رنگ سے محبت چھلکتی اور ہر جہت پیار کا پیغام دیتی تھی۔ان سے عقیدت کے ساتھ ساتھ دوستی کا بھی قریبی رشتہ تھا۔میری دعوت پر جاپان تشریف لائے اور اس دورے کی یادوں کو انہوں نے سفر نامے کی صورت ''آج کا جاپان'' کے نام سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔بار ہامیاں چنوں میرے گھر پر قیام کیا۔متعدد بار مشاعروں میں شریک ہوئے۔جب جب جہاں جہاں انہیں میں نے مدعو کیا ہمیشہ عزت بخشی۔اس تذکرے کا مقصد یہ امر واضح کرنا ہے کہ مجھے گزشتہ ربع صدی کی اس دوستی کے تعلق میں ان کی صحبت میں کافی وقت گزارنے کا موقع ملا۔یہ بلاشبہ ایک خوش قسمتی تو ہے،اس کے ساتھ ساتھ اس عہد ساز شاعر،ادیب،ڈرامہ نگار،کالم نویس،محقق،مترجم،سفرنامہ نگار،معلم اور اعلیٰ اخلاقیات حامل شخصیت کے انسانی پہلوؤں کا قریب سے جائزہ لینے کا بھی بھرپور موقع تھا۔امجد اسلام امجد جتنے بڑے تخلیق کار تھے اتنے ہی بڑے انسان اور انسان دوست تھے۔

ان کی پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی۔تہلکہ خیز اس لئے کہوں گا کہ یہ کتاب نظموں کی تھی۔روایت کی بات کی جائے تو اردو شاعری میں نووار دان اپنے شوق کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔غزل ہمارے مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد موسیقی پر ہے۔قافیہ اور ردیف میوزک پیدا کرتے ہیں۔امجد اسلام امجد کا روایت سے انحراف بغاوت نہیں تھی،چونکہ وہ بہت خوبصورت غزل کہتے تھے،احمد ندیم قاسمی اپنے ادبی پرچے''فنون'' کے لئے ان سے فرمائش کر کے غزل منگواتے اور اہتمام سے شائع کرتے تھے۔امجد اسلام امجد کے الفاظ میں مکمل نظموں کی کتاب سے فنی سفر کا آغاز بڑا رسک تھا۔مگر چونکہ وہ فنکار بڑے تھے۔اس لئے انہیں اپنے فن پر اعتبار تھا،ان کی پہلی کتاب ''برزخ'' تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔شعروسخن کے قارئین نے اسے بے حد پسند کیا۔اس سے پہلے یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر کرکٹر تھے۔اور پاکستان کی قومی ٹیم کا حصہ بننا چاہتے تھے۔اپنے کالج اسلامیہ سول لائنز کی کرکٹ ٹیم میں ان کی حیثیت سپر سٹار کی تھی۔سلیکشن کا وقت آیا تو کوئی سفارشی ان کی جگہ سلیکٹ ہو گیا۔سخت آزردہ خاطر ہوئے۔بلا توڑ دیا۔کبھی کرکٹ نہ کھیلنے کا خود سے عہد کیا۔یہ سوچ کر کہ اس ملک میں سفارش کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ایک انٹرویو میں مجھے بتانے لگے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مجھ پر بڑی رحمت ہوئی تھی۔پوچھنے لگے کہ ہمارے دور میں ایک بڑے اچھے ٹیسٹ کرکٹر گزرے ہیں ممتاز احمد مگر کیا آپ نے ان کا نام بھی سنا ہے؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کرکٹر کا کیریئر بہت مختصر ہوتا ہے۔مگر ادیب اور شاعر تو مرنے کے بعد بھی زندہ وجاوید رہتے ہیں۔

ان کے اپنے الفاظ میں پاکستان بننے میں ابھی تین سال اور دس دن باقی تھے(4اگست 1947) جب لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں ان کی پیدائش ہوئی۔دستکار گھرانہ تھا،میں اس کو روایتی مذہبی خاندان کہنا چاہوں گا۔ان کے والد سے میری متعدد بار ملاقات ہوئی۔بڑے درویش صفت انسان تھے۔امجد اسلام امجد کو میں سعادت مند بیٹا لکھنا چاہوں گا، اپنے والدین کی انہوں نے بڑی خدمت کی تھی۔پڑھائی میں بڑے لائق تھے۔ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی سے مکمل کرنے کے بعد تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔اس دوران تخلیقی کام پر مکمل توجہ رہی۔

اگر یہ کہا جائے کہ امجد اسلام امجد پیدائشی ادیب اور شاعر تھے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔وہ روز اول سے حرفوں کے آدمی تھے۔شعروسخن ان کے خون میں رچے بسے ہوئے تھے۔سال 1975 میں سات سالہ تدریسی فرائض ایم اے او کالج میں ادا کرنے کے بعد،ایک اہم موڑ پنجاب آرٹس کونسل میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر متعین ہونا تھا۔ثقافتی ادارے میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے سبب انہیں تخلیق کے لئے موزوں ماحول دستیاب رہا۔اس تخلیقی فضا کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔یہ اسی زمانے کا ذکر ہے جب ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ''وارث'' پی ٹی وی پر نشر ہوا۔نوجوان

نسل کو تو شائد اندازہ ہی نہ ہو کہ اس ڈرامے کی مقبولیت کس سطح پر تھی۔شہروں اور گاؤں کی سڑکیں آٹھ بجے رات سب سنسان ہو جایا کرتی تھیں۔جس روز اس کی قسط ٹی وی پر نشر ہوتی تھی۔پی ٹی وی کو ٹی وی اس لئے لکھا ہے کہ ان دنوں صرف یہی واحد ٹیلی ویژن چینل ہوا کرتا تھا۔ایک بزرگ نے امجد اسلام امجد کے ہاتھ چومے تو وہ ذرا گھبرائے۔اس پر باریش شخص نے کہا کہ میں ان ہاتھوں کو چوم رہا ہوں جنہوں نے ''وارث'' ڈرامہ، خدا کے فضل سے تخلیق کیا ہے۔ اس کے بعد''دن''اور فشار بھی انتہائی مقبول ہوئے۔یا نصیب کلینک کے علاوہ بھی بے شمار ڈراموں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔مگر''وارث'' نے شہرت دوام پائی۔حال ہی میں چین کے قومی ٹی وی چینل پر اسے چینی سب ٹائیٹل کے ساتھ بھی نشر کیا گیا۔

حکومت کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں پرائڈ آف پرفارمنس جسے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی کہتے ہیں 1987 میں انہیں دیا گیا اور 1998 میں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔بیسٹ فلم رائٹر کا نگار ایوارڈ دو مرتبہ انہیں ملا۔جبکہ پی ٹی وی اور دیگر چینلز سے بے شمار ایوارڈ وصول کیے۔چند سال پہلے ترکی کے سب سے اعلیٰ ادبی انعام نجیب فاضل ایوارڈ انہیں ترک صدر رجب طیب اردگان کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔وہ پہلے پاکستانی تھے جنہیں اس اعزاز سے نوازا گیا۔درجنوں شعروسخن کی معیاری کتابوں، بے شمار ڈراموں، ہزاروں خوبصورت کالموں اور نونہالان وطن کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا صلہ اور اصل ایوارڈ تو لوگوں کی ان سے والہانہ محبت ہے۔ایسی تکریم واحترام اس پاک سرزمین پر جنم لینے والے کم کم لوگوں کے حصے میں ہی آتا ہے جوان کا مقدر بنا۔پاکستانی قوم کی ایک خوبی مجھے بے حد پسند ہے کہ کبھی کسی غلط آدمی کی عزت نہیں کرتے۔

امجد اسلام امجد بنیادی طور پر گھریلو قسم کے آدمی تھے۔گھر گرہستی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔اپنی بیگم فردوس امجد سے بڑی محبت کرتے تھے۔شہروں شہروں ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود بھی ان کا دھیان گھر کی جانب ہی لگا رہتا۔اپنی اولاد سے تو سب کو محبت ہوتی ہے۔مگر ہم شاعروں میں عمومی طور پر ہر ایک لاپرواہی اور کسی حد تک بے نیازی اس باب میں روا رکھی جاتی ہے۔امجد اسلام امجد مگر اس بارے میں بڑے ذمہ دار باپ تھے۔اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی زندگی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ہمہ وقت اس بابت دھیان رکھتے۔ان کی شخصیت کا ایک پہلو بطور مترجم بڑا اہم ہے۔غیر ملکی شاعری سے ہم وطنوں کو روشناس کروانے کے لئے انہوں نے دیس دیس کی شاعری کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔جدید عربی نظموں کے تراجم ''عکس'' کے نام سے شائع ہوئے اور افریقی شعراء کی نظمیں''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' کے نام سے۔

وہ بڑے خوش قسمت تخلیق کار تھے کہ انہیں زندگی میں بے پناہ محبت اور توجہ ملی۔بلاشبہ اس عزت و شہرت کے حق دار بھی تھے۔کیا خوبصورت زندگی گزار گئے کہ زمانے سے انہیں کوئی شکوہ نا تھا اور نہ ہی زمانے کو ان سے کوئی شکایت۔بلکہ دو طرفہ محبت کا معاملہ رہا۔جس کا ثبوت ملک بھر کی سوگوار فضا ہے۔ ہماری خوبصورت روایات میں سے ایک قابل تحسین روایت جانے والے کے متعلق صرف مثبت بات اور تذکرے کی ہے، سچی بات یہ ہے کہ امجد اسلام امجد جیسے لوگ ہیں، جن کے سبب ایسی درخشندہ روایات زندہ رہتی ہیں۔ہم جب اوساکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے دورے پر گئے، پاکستان کے ادیبوں کے اس وفد میں عطاء الحق قاسمی اور محمود شام بھی شامل تھے۔طلباء اور اساتذہ نے ہمیں امجد اسلام امجد کی شاعری کا جاپانی زبان میں ترجمہ دکھایا۔ادیبوں کے وفد کے استقبال کے لیے طلباء وطالبات پاکستانی لباس زیب تن کر کے آئے تھے۔جاپان میں میرے گھر پر قیام پر انہوں نے ایک مکمل مضمون تحریر کیا۔جوان کی بذلہ سنجی کا عمدہ نمونہ ہے۔نوجوان لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ان کی تربیت کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔گرچہ میں نے ان سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، چونکہ وہ نوے کی دہائی میں ایم اے او کالج میں پڑھاتے تھے اور میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم رہا، مگر شعروسخن میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شعر کہنے کی صلاحیت تو خداداد ہے مگر کرافٹ سیکھنا پڑتا ہے۔موزونیت کی صلاحیت کا شکر ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کرافٹ پر بھی توجہ دی جائے۔بڑے ہمدرد اور مرنجان مرنج انسان تھے۔شہرت اور منصب بڑے اچھے لوگوں کا بھی اکثر دماغ خراب کر دیتے ہیں مگر امجد اسلام امجد مستثنیات میں سے تھے۔انتہائی منکسر المزاج۔اصل تعارف اور تحفہ توان کی شاعری قرار پائی ہے۔اگر میں کہوں کہ وہ ہمارے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے تو یہ مبالغہ آرائی نہ ہوگی بلکہ حق گوئی اور سخن فہمی کہلائے گی۔بابا میاں چنوں کے دربار سے ملحقہ قبرستان سے مجھے کبھی نسبت محسوس نہیں ہوتی تھی تاوقتیکہ میری والدہ کا مدفن بن گیا، پھر تمام خوف جاتا رہا اور اپنائیت بھی ہوگئی۔ لاہور کے میانی صاحب قبرستان سے اب قریبی نسبت پیدا ہوگئی ہے چونکہ امجد اسلام امجد کو وہاں دفن کیا گیا ہے۔

منٹو کا ادبی تشخص

لطیف ساحل/لاہور

منٹو کی صحافتی زندگی کے مختلف ادوار منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے اور قیام کے بعد اُس کی صحافتی زندگی تقریباً سترہ سال (۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۰ء) کے عرصے پر محیط ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو لحہ مرگ تک (وفات: ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء) ادب اور صحافت سے اس کا مضبوط رشتہ قائم ودائم رہا۔ منٹو کی صحافتی سرگرمیوں کا دائرہ کار، ادب، فلم اور سماجیات سے ہم آہنگ تھا۔ اُس کی زندگی متحرک، پُر جوش اور اَن تھک تھی۔ اخبارات و رسائل سے اُس کی وابستگی کا اندازہ اُن مختلف نوعیت کے رسائل سے لگایا جا سکتا ہے جن کے ناموں سے ہی فکری اور تہذیبی منظر نامہ کے ساتھ ساتھ منٹو کی شخصیت کے منفرد رنگ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں:

''مدیر''ہلال'' کالج میگزین، ۱۹۳۳ء (۱)

روز نامہ ''مساوات''، امرتسر

مدیر، ''خلق''، امرتسر

روز نامہ ''مروّت''، لاہور

ماہنامہ ''ہمایوں''، لاہور

روز نامہ ''پارس''، لاہور

مدیر ہفتہ وار ''مصور'' بمبئی ۱۹۳۶ء۔ مئی ۱۹۳۷ء۔ علیحدگی ۱۳ جولائی ۱۹۴۰ء دوبارہ وابستگی ۱۷/ اگست ۱۹۴۱ء

ہفت روزہ ''سماج''، بمبئی ۱۹۳۸ء

ہفت روزہ ''کارواں''، بمبئی

ہفت روزہ ''کہکشاں''، بمبئی

ایڈیٹر ''Famous Picture Magaznine'' ستمبر ۱۹۴۰ء

ہفت روزہ ''احسان'' لاہور

روز نامہ ''منشور'' لاہور

روز نامہ ''مغربی پاکستان'' لاہور

روز نامہ ''امروز'' لاہور ۱۹۴۸ء

مدیر ''اُردو ادب'' مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۴۹ء

مدیر ہفت روزہ ''نگارش'' لاہور اکتوبر ۱۹۵۰ء'' (۲)

قیامِ پاکستان کے بعد روز نامہ ''امروز'' لاہور، ''اُردو ادب'' لاہور اور ''نگارش'' لاہور سے اُس کی وابستگی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ زندگی کے اس آخری دور میں پاکستانی ادیب کی حیثیت سے منٹو کی ادبی خدمات توجہ طلب ہیں۔ سرحدوں کا جغرافیائی تصوّر اور بدلے ہوئے حالات کا احساس، قدرتی طور پر ادیبوں کے فکری اور جذباتی نظام کا حصہ بن چکا تھا۔ یہ سب کچھ محض ایک لمحے کی تخلیق نہ تھا بلکہ اس تبدیلی کی جڑیں بڑی گہری اور اس کے نتائج دُور رس تھے۔ اختر شیرانی کی حسن آفریں شاعری خصوصی طور پر اور رومانوی ادب عمومی طور پر پُر سکوں اور پس دیوار ہو گیا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کی تنظیمی اور ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ادب میں روشن خیالی اور جنسی اظہار کے نام پر مغربی ادب سے وابستگی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ اردو ادب میں اصناف کے نئے تجربوں کے لیے حلقہ اربابِ ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں میں خوب گہما گہمی تھی۔ پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تفہیم اور ترویج کے سلسلے میں بھی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ مشرق و مغرب کا معرکہ گرم تھا، ہیئت و اسلوب پر بحثیں جاری تھیں۔ فکر و خیال کی ہر لحہ تبدیل ہوتی ہوئی اس وقت کی ادبی دنیا میں حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو کا ایک دوسرے کی رفاقت میں ''اردو ادب'' کا شائع کرنا، ان تمام کڑیوں سے جڑا ہوا ایک خاکہ تھا جو اس متنوع ادبی صورتِ حال سے نکل کر بالکل نمایاں ہو گیا تھا۔ پاکستان کے قیام کے اس متحرک لمحے کے تناظر میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

''اس جہان کو دیکھئے تو اس میں چیخوف نے کیا لکھا ہے، ٹولسٹوئے نے کیا لکھا ہے اور دوستوئیفسکی نے کیسا ناول لکھا تھا تو ہم اسی دنیا میں ہی تھے اور ہم کسی حد تک اسے اپنے دائرہِ ادراک میں لے آئے تھے یا لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب ان سب سے ہٹ کر یہ بھی احساس ہوا کہ ہمارا مشرق جو ہے، وہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے، جس کو ہم نے فراموش کر دیا تھا۔'' (۳)

قیامِ پاکستان کے جَلو میں جو سب سے بڑی ادبی تحریک، نئی جغرافیائی حدود میں اثر پذیر ہو رہی تھی، وہ ترقی پسند تحریک تھی۔ یا تو اس کے حق میں لکھا جا رہا تھا یا اُس کے مخالف! یہاں تک کہ ایسے ادیبوں، جن کی ادبی اور تخلیقی کاوشیں گروہ بندی سے آزاد تھیں، کو بھی کسی نہ کسی طور ادبی گروہی سیاست سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ منٹو کے ادبی تشخص کے بارے میں بھی ایسی متضاد معلومات، ادیب کے قاری کے سامنے آتی ہیں جس سے اُس کی تخلیقات کی سماجی تفہیم میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری کا مرتب کیا ہوا رسالہ ''اردو ادب'' لاہور، انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

''اُردو ادب'' کے صرف دو شمارے شائع ہوئے۔ اس کا سائز عام رسائل سے بالکل مختلف تھا۔ یہ رسالہ ۱۵.۵×۱۸اس م سائز میں تھا۔ عام رسائل سے قطع نظر اس کی چوڑائی، اونچائی سے زیادہ تھی۔ پہلے اور دوسرے شمارے کے ٹائٹل کا ڈیزائن ایک ہی تھا صرف رنگوں کی سکیم کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ پہلے شمارہ کے ٹائٹل پر ۱ اور دوسرے شمارہ کے ٹائٹل پر ۲ لکھا گیا

تھا۔(۴) جبکہ مکتبہ جدید کا مونو گرام بھی دونوں شمارہ کے ٹائٹل پر ظاہر ہے۔ سطروں کی لمبائی (حوض) ۱۴ س م اور ایک صفحے پر سطروں کی تعداد ۲۱ ہے۔ ہر صفحے کے بالائی حاشیے میں ''اُردو ادب'' لکھا گیا ہے۔ جبکہ صفحے کا نمبر شمار، صفحے کے نچلے حاشیے میں دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ صفحوں کی ترتیب کے حوالے سے اسے ہر طرح سے منفرد بنایا گیا ہے۔ دونوں شماروں میں تصاویر بھی شامل ہیں لیکن انھیں صفحوں کے شمار میں نہیں لایا گیا۔

''اردو ادب'' کے پہلے شمارہ کے بیک ٹائٹل پر اس شمارہ کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے:

''اُردو ادب: آپ صرف ایک دفعہ خریدیں گے۔ دوسری دفعہ آپ اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اُردو ادب: تحفے کے طور پر کسی دوست یا عزیز کو دینا بڑے ہی خوبصورت طریقے پر اس کے ذوق کو داد دینا ہے۔

اُردو ادب: سے اشتراک پورے اردو ادب سے اشتراک ہے۔

اُردو ادب: ترقی کو صرف پسند نہیں کرے گا بلکہ ترقی کے لیے ایسی راہیں پیدا کرے گا کہ وہ خود اردو ادب سے ہمکنار ہو۔''(۵)

مذکورہ بالا جملے نہ تو پبلشر کی تحریر ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کا شعر و ادب سے منسلک ہونا کوئی ضروری شرط نہیں ہے اور نہ ہی یہ جملے حسن عسکری کے ہو سکتے ہیں کہ اس طرح کا اشتہار لکھنا اُس کی طبیعت کی متانت سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ جملوں کی کاٹ اور تخاطب کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ جملے سعادت حسن منٹو کی شوخیٔ تخلیق کا کرشمہ ہیں۔ اس تحریر کا آخری جملہ قابل توجہ ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اردو ادب، ترقی کو صرف پسند نہیں کرے گا بلکہ ترقی کے لیے ایسی راہیں پیدا کرے گا کہ وہ خود اردو ادب سے ہمکنار ہو۔ اس جملے کے تجزیاتی مطالعے سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) ''اُردو ادب، ترقی کو صرف پسند نہیں کرے گا۔'' اس جملے میں ترقی پسندوں کی طرف کھلا اشارہ ہے اور اس جملے میں ترقی پسندوں کے لیے طنز کا پہلو نمایاں ہے۔

(۲) اس جملے میں ترقی پسند ادیبوں سے اختلافی نقطہ نظر کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۳) اس جملے میں ترقی پسندوں کے لیے ''ترقی'' کے لفظ کو ''ذاتی ترقی'' کے معنوں میں لیا گیا ہے اور ان کی ادبی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

(۴) جملے کے دوسرے حصے میں ''ترقی'' کے اردو ادب سے ہمکنار ہونے کی بات کی گئی ہے اور ''اُردو ادب'' کے الفاظ کو عمومی طور پر ''ادب'' اور خصوصی طور پر مذکورہ رسالہ (جس کا نام اردو ادب تھا) کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس جملے کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ ''اُردو ادب'' کے اجرا سے ادب ترقی کرے گا۔ اس جملے میں ذاتی ستائش کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

پہلے شمارہ کی بیک ٹائٹل کی مذکورہ بالا تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''اُردو ادب'' کا اجرا ترقی پسندوں کے لیے کھلا اعلانِ جنگ تھا۔

''اُردو ادب'' کا ناشر مکتبہ جدید لاہور تھا اور یہ رسالہ کواپریٹو کیپٹل پریس لاہور میں چھپا۔ جبکہ اس کے منیجر کا پتہ ''منیجر اردو ادب، پوسٹ بکس ۲۲۵ کراچی'' لکھا گیا تھا۔(۶) اور اس کی قیمت ۶ روپے آٹھ ۸ آنے تھی۔ اس رسالہ کو ''دوماہی اُردو ادب'' کہا گیا۔(۷)

''اُردو ادب'' کے ناشر کا لاہور سے متعلق ہونا اور منیجر کے کراچی سے متعلق ہونے کا معمہ، شمارہ نمبر ۱ کے اداریے سے حل ہوتا ہے۔ منٹو لکھتے ہیں:

''اُردو ادب شائع ہونا تو دُور رہا ابھی پوری طرح مرتب بھی نہیں ہوا تھا کہ دنیائے ادب میں ایک افسانہ بن گیا۔ کسی کو خطرہ پیدا ہوا کہ رجعت پسندوں کا محاذ بن رہا ہے۔ کسی کو دھڑکا ہوا کہ یہ کوئی پیری مریدی کا سلسلہ ہے۔ کسی کو پتہ چلا کہ یہ رسالہ پاکستان کی حکومت کا ایجنٹ ہوگا۔ اسی رسالے کے دم سے اردو میں ایک نئی صنفِ ادب ''کھلے خط'' کا اضافہ ہوا۔ غرض لوگ طرح طرح سے کھلے۔''(۸)

اس اداریے سے منٹو کے ذہن میں پیدا ہونے والے تین طرح کے فکری رویوں کا احساس ہوتا ہے جسے اُس نے دوسروں کے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشات سے تعبیر کیا ہے۔ یقیناً ایسی ہی باتیں ''اُردو ادب'' کے اجرا کے بارے میں ضرور ہوئی ہوں گی اور اس میں کسی نہ کسی طور پر حقیقت کا عنصر بھی ضرور موجود تھا۔ تبھی تو منٹو نے ان خدشات کو اس قدر اہمیت دی اور اس اداریے کا حصہ بنایا۔ منٹو کے یہ خدشات، تجزیہ طلب ہیں؛

(۱) ''(رسالہ اردو ادب) رجعت پسندوں کا محاذ بن رہا ہے''

رجعت پسندی، اردو ادب میں ایک مستعمل اور جانی پہچانی اصطلاح ہے۔ سادہ لفظوں میں روایت پرستی اور جدیدیت سے متضاد ادبی رویوں کو رجعت پسندی کہا جاتا ہے۔ منٹو کے دور میں ترقی پسندی ہی جدید ترین رویہ تھا۔ اس اصطلاح سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسالہ اُردو ادب کے اجراء کو ترقی پسندوں کے خلاف ایک محاذ کے آغاز سے تعبیر کیا گیا۔ منٹو نے اس الزام کی صرف نشاندہی کی اور اس کی تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں کے مخالفانہ روّیے کو اُس نے زیادہ اہمیت نہیں دی اور قابل اعتنا نہیں سمجھا۔

(۲) ''(رسالہ اُردو ادب) کوئی پیری مریدی کا سلسلہ ہے''

پیری مریدی کے الفاظ، اُردو ادب کے تناظر

میں اسلامی اور مذہبی ادب وعلوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ بات ادب کے تناظر میں ہو رہی ہے۔ یہاں بات کسی خاص مذہبی روّیے یا عقیدے کی ہرگز نہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب کے تقاضوں کو موضوعِ بحث بنایا جانے لگا تھا اور حسن عسکری کے مختلف مضامین میں اردو ادب کے مقاصد زیرِ بحث آئے ہیں۔ منٹو کا حسن عسکری سے جڑنا منٹو کے ادبی تشخص پر عسکری کے فکری اثرات کا پیش خیمہ تھا۔ پیری مریدی کے الفاظ سے اس احساس کی نشاندہی ہوتی ہے کہ شاید اب منٹو بھی اپنے منفرد اور بھرپور ادبی اسلوب کو چھوڑ کر اپنے افسانوں میں اسلامی موضوعات کو ''مذہبی انداز'' سے پیش کرنے لگے گا۔ منٹو کے اُس کی زندگی کے آخری لمحے تک افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ رسالہ اُردو ادب کے زیرِ اثر اس طرح کا کوئی لیبل اُس کے ساتھ منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ''پیری مریدی'' کے الفاظ صرف طنز کے طور پر ہی کہے گئے ہیں اور اپنی ذات کو مخالفوں کی ایسی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔

(۳) ''یہ رسالہ پاکستانی حکومت کا ایجنٹ ہوگا''

منٹو کا یہ جملہ انتہائی معنی خیز اور گہرائی کا حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ترقی پسندوں نے اپنے مخصوص نظریات کے باعث مغربی ممالک کی طرف دیکھنے کے بجائے سیاسی طور پر کمیونزم کو اپنایا اور روس کا حلیف بنے اور روسی ادب کو اپنا فکری اثاثہ بنانے کی کوشش کی۔ پاکستان کے قیام کے بعد آزادی کے احساس کے باعث مغرب سے چھٹکارا پانے کا رجحان بیدار ہوا تھا اور اس کا زیادہ تر فائدہ ترقی پسند تحریک کو حاصل ہوا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت میں کافی حد تک مغرب دشمنی کے احساس کا عمل دخل بھی تھا۔ جبکہ پاکستانی حکومت یا اسٹیبلشمنٹ اسے کسی طور پر پسند نہیں کرتی تھی۔ پاکستان کی آزادی کو بھی نوآبادیاتی تسلسل کا ہی ایک حصہ بنا کر رکھا گیا۔ اس تناظر میں رسالہ ''اُردو ادب'' کو پاکستانی حکومت کا ایجنٹ کہنے کا مقصد یہی تھا کہ اس کے مرتبین اور اس میں شامل ہونے والے ادیبوں کا رجحان ''مغرب پسندی'' ہوگا۔ یہ الزام کسی حد تک درست بھی تھا۔ البتہ ''ایجنٹ'' ہونے کا یہ مقصد نہیں کہ یہ رسالہ حکومت پاکستان کے فنڈ سے جاری کیا گیا ہے۔ اس بیان سے حکومت پاکستان کو یہ بھی باور کرانا مقصود تھا کہ ہم پر حکومت کی حمایت کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ جبکہ حکومت ہمارے رسالہ کے اجرا میں کوئی تعاون نہیں کر رہی اور رسالہ کی اشاعت کے سلسلے میں ہم مشکلات کا شکار ہیں۔

اس امر کی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری ہے کہ ترقی پسند تنظیم کے قیام میں اشتراکی نظریات کے حامل ممالک سے مغربی ممالک کا ہاتھ تھا۔

''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' کی بنیاد لندن میں مقیم ان ادیبوں کے ہاتھوں رکھی گئی جو اشتراکیت کے فلسفے سے متاثر تھے:

''۱۹۱۷ء میں جب بوشویکیوں نے زارِ روس کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر انقلاب برپا کیا تو پوری دنیا میں کچلے ہوئے طبقوں اور معاشی عدم مساوات کا شکار لوگوں میں مارکسزم نے اُمید کی لہر دوڑا دی۔ معاشی مساوات کے مارکسی نظریات نے دنیا بھر کے دانشوروں کو متاثر کیا۔ برِعظیم میں بھی پڑھے لکھے طبقے میں مارکسی نظریات پہنچے اور ان کی بازگشت یہاں کے ادیبوں اور مفکروں کے ہاں سنائی دینے لگی۔ بعد میں ایسے تخلیق کاروں کی ایک باقاعدہ تنظیم بنی۔ اس تنظیم کی بنیاد لندن میں برِعظیم کے چند ایسے نوجوانوں کے ہاتھوں رکھی گئی جو لندن میں دورانِ تعلیم اشتراکیت کے فلسفے سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ایک ادبی حلقہ قائم کیا۔ اس حلقے کو ہی بعد میں تنظیم کی شکل دی گئی اور اس کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' (Indian Progressive writers Association) رکھا گیا۔ اس کا ایک منشور بھی تھا اور آگے چل کر اسی تنظیم نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔''(۹)

ترقی پسند تحریک کے فکری محرکات اور تنقیدی نظریات پر یہاں بحث کی زیادہ گنجائش موجود نہیں۔ تاہم اس سلسلے میں چند اہم کتب کا حوالہ دینا ضروری ہے جن کے مطالعہ سے اس تحریک کے حوالے سے 1947 سے قبل اور 1947 کے بعد ترقی پسند ادب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (ترقی پسند ادبی تحریک کی مفصل تاریخ، تفصیلات و نظریات کے مطالعہ کے لیے)

(۲) سجاد ظہیر: روشنائی (تحریک کی تاثراتی تاریخ کے لیے)

(۳) علی سردار جعفری: ترقی پسند ادب (تحریک کو جعفری کے ذاتی زاویے سے جائزہ لینے کے لیے)

(۴) عزیز احمد: ترقی پسند ادب (تحریک کے اختلافی پہلوؤں کے لیے)

(۵) ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر: مرتبہ قمر رئیس و عاشور کاظمی (تحریک کے جائزے، مسائل، نظریات اور ادبی تخلیقات پر تنقید کے لیے)

''اُردو ادب'' کی اشاعت کے سلسلے میں مرتبین کو پنجاب کی حد تک حکومتی سطح پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن کراچی سے اس کی اشاعت کی اجازت حاصل کر لی گئی۔ منٹو لکھتے ہیں:

''ہم نے کہیں جون ۱۹۴۸ء میں کام شروع کیا تھا لیکن جب چھ مہینے ہونے کو آئے اور مرتب شدہ پرچے میں رکھے رکھے پھپھوندی لگ گئی تو حکومت کے دفتر نے ''جلد'' اجازت دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ

شرمندۂ تکمیل ہوتا نظر نہ آیا۔ تھک ہار کر ہم نے کراچی سے رجوع کیا اور گھنٹے بھر کے اندر اندر اجازت حاصل کرلی۔"(۱۰)

کراچی سے گھنٹے بھر میں اجازت کے حصول سے منٹو اور عسکری کے حکومتی سطح پر اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے اور "یہ رسالہ پاکستانی حکومت کا ایجنٹ ہوگا" کے ترقی پسندوں کے بیان کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے۔

اُردو ادب میں محاذ آرائی کی اس فضا کے بارے میں ڈاکٹر محمد سعید ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"اگست ۱۹۴۸ء سے پہلے تک ترقی پسندوں کے "قصیدوں" کا موضوع محمد حسن عسکری بنے رہے اور یہ "قصیدے"، "تشبیب" اور "گریز" سے گزر کر "مدح" پر آ چکے تھے لیکن اگست کے بعد منٹو بھی (بغیر تشبیب اور گریز کے) براہِ راست اس "مدح" کا موضوع بن گئے۔ منٹو اس مدح کے سزاوار دو حوالوں سے بنے، ایک تو دو ماہی "اُردو ادب" اور "سیاہ حاشیے" دونہیں ایک ہی بات تھی کہ ان دونوں سے محمد حسن عسکری کا تعلق تھا۔ اُردو ادب کے اجرا کے اعلان سے "آگ لگی" اور "سیاہ حاشیے" کی اشاعت پر "بھڑک اُٹھی"۔ آخر اگست یا شروع ستمبر میں منٹو کی "سیاہ حاشیے" محمد حسن عسکری کے دیباچے کے ساتھ شائع ہو چکی تھی۔ ویسے تو اس میں محمد حسن عسکری کے دیباچے کی خبر پہلے ہی ترقی پسند احباب کو ہو چکی تھی لیکن جس طرح پاکستان آنے کے بعد محمد حسن عسکری کے خلاف سب سے پہلے عبداللہ ملک نے تلوار نکالی اسی طرح "سیاہ حاشیے" کے خلاف بھی سب سے پہلی تلوار عبداللہ ملک کی نیام سے نکلی۔"(۱۱)

رسالہ "اُردو ادب" کے اجرا سے قبل منٹو کے نہ صرف شخصی رابطے اور دوستانہ مراسم ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ تھے بلکہ افسانوی ادب میں موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے بھی وہ ترقی پسندوں کے فکری رجحانات کے قریب تر تھے۔ اسی لیے "اُردو ادب" کے اجرا اور حسن عسکری کے ساتھ ادبی روابط کے فروغ کے باعث ترقی پسندوں کو فکر لاحق ہوئی۔ اپنے ایک خط میں فکر تونسوی لکھتے ہیں:

"برادرم منٹو صاحب!

میں مشورہ دے سکتا ہوں نہ نصیحت کرنے کا اہل ہوں۔ اس لیے کہ "اُردو ادب" پر تبصرہ کرنے والے اہل نظر کی کمی نہیں۔

آپ پر اور آپ کے گزشتہ اور موجودہ آرٹ پر جو لے دے ہوئی، اُسے پڑھتا اور سنتا رہا ہوں۔ اس سارے غوغا پر سوائے اس کے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ ترقی پسند دوستوں سے بچھڑ گئے۔ یہ جدائی مستحسن نہیں۔

فکر تونسوی

جالندھر، ۱۸ اگست ۱۹۴۹ء"(۱۲)

ترقی پسندوں سے منٹو کی دوستی کے حوالے سے "منٹو کے خطوط، احمد ندیم قاسمی کے نام" ایک واضح ثبوت ہے۔ منٹو کی فکری بنیاد اور ترقی پسندوں کی سوچ ایک ہی تھی۔ ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"منٹو کو غلامی سے نفرت تھی۔ غلام بنانے والوں اور کمتر سمجھنے والوں سے نفرت تھی۔ اس لیے انگریزوں سے نفرت تھی۔ اس کا تخلیقی اظہار پوری توانائی کے ساتھ "نیا قانون" میں ہوا۔ مگر "آتش پارے" کی "خونی تھوک" میں بھی استاد منگو کا شعلہ انتقام رقصاں ملتا ہے۔"(۱۳)

منٹو کے افسانوں کی انہی موضوعاتی خصوصیات کے باعث سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں اُن کا نام ترقی پسندوں میں شامل کیا ہے۔ دورِ حاضر میں بھی ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ایک مضمون میں منٹو کا شمار ترقی پسند ادیبوں میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ترقی پسندوں کے ہراول پریم چند اور ان کے بعد کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، عزیز احمد، بلونت سنگھ، علی عباس حسینی، اختر اورینوی، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور جیسے افسانہ نگاروں کی صورت میں افسانے میں حقیقت نگاری، واقعیت نگاری اور (انسانی) فطرت نگاری نے اپنی اساس مستحکم کی۔"(۱۴)

آگے چل کر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تعریف کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کو ڈاکٹر سلیم اختر دوبارہ زیر بحث لاتے ہیں:

"اردو افسانے کی تاریخ میں ترقی پسند افسانے کو اُردو افسانے کا زرّیں دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ کرشن چندر کی انسانی دوستی، سعادت حسن منٹو کی انسانی سائیکی کی ایکسپلوریشن، راجندر سنگھ بیدی کی نفسیاتی ژرف بینی، عصمت چغتائی کی نسوانی کردار نگاری، احمد ندیم قاسمی کی استحصال کے شکار مرد و زن کے المیوں کی تصویر کشی، ترقی پسند افسانے کی یہ چند بے حد نمایاں مثالیں ہیں۔"(۱۵)

جبکہ غیر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں وہ منٹو کا نام شامل نہیں کرتے:

"ترقی پسند افسانے کے متوازن (مگر ان سے ہٹ کر) لکھنے والوں میں حسن عسکری، ممتاز شیریں، غلام عباس، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر نمایاں نظر آتے ہیں۔"(۱۶)

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے منٹو کو ترقی پسندوں میں سہواً شامل نہیں کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خیال میں منٹو بھی اپنے فکری اور اپنے افسانوں کے موضوعاتی اعتبار سے ترقی پسند تحریک کا حصہ تھے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک کا آغاز بھی اظہار و بیان کے اُس "آزادانہ رویے" سے ہوا جس کا الزام منٹو پر بھی لگایا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں ''انگارے'' کی اشاعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر انوار احمد ''انگارے'' کی اشاعت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ نوجوان ادیب جانتے تھے کہ ''انگارے'' کی اشاعت پر ادبی میدان میں ہی نہیں سیاسی و سماجی بالخصوص مذہبی حلقوں میں شدید ردِ عمل ہوگا۔ مگر جس پیمانے پر انھیں ''گالیاں'' پڑیں اور دھمکیاں ملیں، انھیں شاید اس کا اندازہ نہیں تھا۔ بہر طور تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۵ الف کے تحت اسے ضبط کر لیا گیا اور اس کی ضبطی کا باضابطہ اعلان ۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء کے سرکاری گزٹ میں ہوا۔''(۱۷)

ڈاکٹر انوار احمد ''انگارے'' میں شامل افسانوں کو سیاسی اور سماجی تناظر میں پرکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''انگارے میں مذہبی قدامت پسندی، تنگ نظری اور موقعہ پرستی کے ساتھ ساتھ بالائی طبقات کے تضادات، حفظ اخلاق اور بوالہوسی، انسان دوستی اور قوتِ مردی کی نمائش ''رعایا پروری'' اور اس سے کراہت اور سیاسی روّیوں کو شعوری طور پر ہدف تنقید بنایا گیا۔''(۱۸)

دسمبر ۱۹۳۲ء میں نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے ایک ہزار کی تعداد میں نو افسانوں اور ایک ڈرامے کا مجموعہ ''انگارے'' ۱۳۴ صفحات پر مشتمل چار افراد (سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر) کی مشترکہ تخلیقی کاوش کے طور پر منظر عام پر آیا۔

یہ ڈرامہ ہے مگر انگارے کے سرورق پر بھی یہ عبارت موجود ہے، دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ)

جوان مردی محمود الظفر ۱۲۱ تا ۱۳۴

(محمود الظفر نے پہلے اسے انگریزی میں لکھا۔ پھر سجاد ظہیر نے اسے اردو کا روپ دیا)(۱۹)

دیکھا جائے تو ۱۹۳۲ء (انگارے کی اشاعت) سے لے کر ۱۹۳۶ء (انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس) تک ترقی پسند تحریک میں ایک نمایاں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ وہ تنظیم جس کا آغاز موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے محض ''آزادہ روی'' سے ہوا تھا۔ سیاسی اور سماجی پر پرزے نکالنے لگی۔ انجمن کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ میں لکھنؤ میں ہوئی جس میں ''رجعت پسندی'' اور ''ہیئت پرستی'' کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا:

''اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلایں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پسندی، جس کی موت لازمی اور یقینی ہے، اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست وریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔''(۲۰)

سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ٹیگور، پریم چند اور اقبال کا نام بھی لیا ہے:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے جو صرف ایک زبان تک محدود نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی ہر زبان کے بہترین ادیب اس تحریک سے وابستہ ہیں۔ ویسے اس کے لیے یہ سعادت بھی کچھ کم نہیں کہ اس کو ٹیگور اور پریم چند، جوش ملیح آبادی اور ولاتھول کی سرپرستی نصیب ہوئی اور اقبال کی دُعائیں ملیں۔ اس کے پہلے اعلان نامے پر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسن اور مولانا نیاز فتح پوری کے بھی دستخط تھے۔''(۲۱)

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو ادب، تاریخ کے جس موڑ پر تھا اُس میں ترقی پسند تحریک نمایاں اہمیت کی حامل تھی اور اس کی اہمیت کا احساس خود ترقی پسندوں کو بھی تھا۔ اس لیے جب حسن عسکری اور منٹو نے ''اُردو ادب'' کا اجرا کیا تو محاذ آرائی کے اس ماحول میں ترقی پسندوں نے ''اُردو ادب'' سے عدم تعاون کی راہ اختیار کی۔

''اُردو ادب'' میں عارف عبدالمتین کا یہ خط شائع ہوا اور سعادت حسن منٹو نے اسے ''حقہ پانی بند'' کا عنوان دیا:

''بھائی جان تسلیم!

میرا منظوم ڈرامہ کچھ مدت سے آپ کی تحویل میں ہے۔ میں متعدد مرتبہ مسودہ حاصل کرنے کے لیے چوہدری صاحب سے ملا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد میں علیل ہو گیا۔ براہِ کرم ڈرامے کا مسودہ مجھے لوٹا دیجیے۔ اب ''اُردو ادب'' میں اسے شائع کروانا میرے لیے بالکل ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ مجھے رات اطلاع ملی ہے کہ میری علالت کے دوران میں ہماری انجمن نے بعض ادبا سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا ہے۔ ذاتی طور پر میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے اور میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن انجمن کے ایک ذمہ دار رُکن کی حیثیت سے اس کے فیصلوں کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ڈرامے کی اشاعت رکوا کر مجھے اس فرض کی تکمیل میں مدد فرمائیں گے۔ شکریہ!

عارف عبدالمتین

لاہور ۹ ستمبر ۱۹۴۹ء''(۲۲)

گروہی ادب کی اس فضا میں منٹو کو ہم عصر ترقی پسندوں کی مخالفت کا سامنے کرنے کے ساتھ ساتھ بعض اہم ادبی شخصیات کی حمایت بھی حاصل ہوئی۔ ایک طرف تو منٹو کے چھ افسانوں (دھواں، بُو، کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، کھول دو) پر فحاشی کے الزام میں مقدمات چلے اور دوسری طرف اُن کے حمایتیوں نے اسے غیر فحش ادیب قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثر انہیں

''غیر فحش'' ادیب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابھی منٹو کا افسانہ پڑھنا ہے۔ شاید وہاں کچھ مل جائے کیونکہ اُسے محراب و منبر پر جلوہ آرائیاں کرنے والے واعظوں کی خلوتی خواہشوں کو رُسوا کر کے چڑانے میں مزا آتا ہے۔ شریر ہے، گالی بکنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ لیکن فحاشی کے لیے جو شدت اور انہماک درکار ہے، وہ اس کی طبیعت میں موجود نہیں۔ اس کی صحت مند ہنسی اور شرارت اُسے فحاشی کی بیماری میں مبتلا نہیں ہونے دیتی۔'' (۲۳)

''اُردو ادب'' کے پہلے شمارے میں منٹو نے ''شہید ساز'' کے عنوان سے اپنا جو افسانہ شامل اشاعت کیا ہے وہ فحاشی کے الزام سے گریز کا بھرپور اظہار ہے۔ تقسیم ہند کے حوالے سے لکھے گئے اس افسانے کا پلاٹ ہمیں ایک ایسے کردار سے آگاہی سے ہمکنار کرتا ہے جس کا تعمیرات کا کام ناقص ہونے کے باعث لوگوں کی اموات کا سبب بنتا ہے۔ چونکہ اتفاقیہ اور حادثاتی موت مرنے والوں کو شہید قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس افسانے کے مرکزی کردار کو ''شہید ساز'' کہا گیا ہے کیونکہ وہ لوگوں کو حادثاتی اموات سے ہمکنار کرتا ہے۔ (۲۴)

''اردو ادب'' کے شمارہ نمبر ۱ میں ایک لطیفہ بھی شامل اشاعت ہے، جس کے خالق منٹو ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لطیفے کو منٹو کی ایک گمشدہ تحریر کے طور پر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''عریانی - ایک بادشاہ اپنے بچوں کو تصویریں دکھانے لے گیا۔ وہاں آدم اور حوا کی ایک تصویر ننگی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے پوچھا بتاؤ ان دونوں میں سے حوا کون ہے؟

بچوں نے جواب دیا ''یہ کپڑے تو پہنے ہی نہیں ہیں پہچانیں کیسے؟'' (۲۵)

اس تحریر سے ''عریان'' کے نئے معنی معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ یہ جملے منٹو کی ذہانت اور منفرد تخلیقی اُپج کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لطیفے کو منٹو کا مختصر ترین افسانہ کہا جا سکتا ہے اور اسے منٹو کے افسانوں میں شامل ہونا چاہیے۔

حواشی و تعلیقات

(۱) ۱۹۳۳ء میں منٹو، ایم-اے-او کالج امرتسر میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ وہ ایف-اے کی تعلیم مکمل نہ کر سکے لیکن ایک طالب علم کی حیثیت سے کالج کے میگزین کی ادارت میں شامل رہے۔ اس سے ان کے ادبی میلان کا پتہ چلتا ہے۔ (راقم)

(۲) شمشیر حیدر شجر، منٹو: ماہ و سال کے آئینے میں، بشمولہ سعادت حسن منٹو، مرتبہ: شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن: لاہور، شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، بارِ اوّل ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۴

(۳) اردو افسانے کے سو سال، انتظار حسین: بشمولہ نگارشات، لاہور، الحمرا عالمی ادبی و ثقافتی کانفرنس، ۲۰۱۱ء اشاعتِ اوّل، صفحہ ۲۴۶

(۴) ضمیمہ نمبر ۱ اور ۲

(۵) ضمیمہ نمبر ۳

(۶) ضمیمہ نمبر ۳ اور ۴

(۷) سعادت حسن منٹو، حسن عسکری (مرتب): اردو ادب (نمبر ۲) لاہور، مکتبہ جدید، صفحہ ۱۰

(۸) سعادت حسن منٹو، حسن عسکری (مرتب): اداریہ، اردو ادب (نمبر ۱) لاہور مکتبہ جدید، صفحہ ۳

(۹) رؤف پاریکھ، ڈاکٹر: اردو نثر میں مزاح نگاری، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت اوّل ۱۹۹۶ء صفحہ ۳۰۹

(۱۰) سعادت حسن منٹو، حسن عسکری (مرتب): اداریہ، اردو ادب (نمبر ۱)، لاہور، مکتبہ جدید، صفحہ ۳

(۱۱) محمد سعید، ڈاکٹر: سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کا ''اُردو ادب'': بشمولہ، سعادت حسن منٹو۔ (پچاس برس بعد)، لاہور، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، بار اوّل ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۲۱

(۱۲) سعادت حسن منٹو، حسن عسکری (مرتب): اردو ادب (نمبر ۲)، لاہور، مکتبہ جدید، صفحہ ۳۱۲

(۱۳) انوار احمد، ڈاکٹر: اردو افسانہ تحقیق و تنقید، ملتان، بیکن بکس، بار اوّل ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۱۵

(۱۴) سلیم اختر، ڈاکٹر: اردو افسانہ، حقیقت نگاری سے آگے، بشمولہ، نگارشات، لاہور، الحمرا عالمی ادبی و ثقافتی کانفرنس ۲۰۱۱ء صفحہ ۲۵۱

(۱۵) ایضاً صفحہ ۲۵۱

(۱۶) ایضاً صفحہ ۲۵۱

(۱۷) انوار احمد، ڈاکٹر: اُردو افسانہ، تحقیق و تنقید، ملتان، بیکن بکس، بار اوّل ۱۹۸۸ء، صفحہ ۱۳۳

(۱۸) ایضاً صفحہ ۱۳۳

(۱۹) ایضاً صفحہ ۱۳۲

(۲۰) سردار جعفری: ترقی پسند ادب، لاہور، مکتبہ پاکستان، بار اوّل س ن، صفحہ ۲۱

(۲۱) سردار جعفری: حرفِ اوّل (بمبئی دسمبر ۱۹۵۰ء) بشمولہ ایضاً صفحہ ۱۵

(۲۲) سعادت حسن منٹو، حسن عسکری: مرتب، اُردو ادب (نمبر ۲) لاہور مکتبہ جدید صفحہ ۳۱۶

(۲۳) تاثیر، محمد دین، ڈاکٹر: مقالات تاثیر، مرتبہ ممتاز اختر مرزا، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اوّل جون ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۵۷

(۲۴) سعادت حسن منٹو: شہید ساز، بشمولہ، اُردو ادب نمبر ۱، محولہ بالا صفحہ ۷۷ تا ۸۲

(۲۵) سعادت حسن منٹو، حسن عسکری: محولہ بالا، صفحہ ۹۹

ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

شاہ لطیف کے خبر کی آخر آرام گاہ کے بارے میں نیا انکشاف[1]

(کلیم اللہ لاشاری)

مغربی دانشور اور سندھ میں ایک عرصے تعینات رہنے والے پرانے افسر ڈاکٹر ایچ ٹی سورلے کے بقول شاہ عبدالطیف بھٹائی کی سوانح حیات لکھنا اب ممکن نہیں رہا۔ ان کی رائے میں سوانح عمری لکھنے کے لیے جو ذرائع درکار ہوتے ہیں وہ اب موجود نہیں رہے۔[2]

اپنی دھرتی سے وابستہ لوگوں کی کہانیوں کے حوالے سے شاہ بھٹائی کے پیار بھرے نغموں نے جہاں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں لطیف احساسات کو جنم دیا ہے اور لوگ ان کرداروں کو بخوبی جاننے لگے ہیں۔ وہاں یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کی ذاتی زندگی پر ابھی تک مکمل تحقیق نہیں ہوئی۔

انیسویں صدی کے آواخر تک ایسے لوگ موجود تھے جن کے پاس شاہ لطیف کی ذاتی زندگی سے متعلق وثوق سے کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بلکہ نہیں بہت سی روایات کہانیوں کی صورت میں ازبر تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کی بہت ہی فعال زندگی کے بارے میں بیش بہا روایات کو حقائق کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت تھی، لیکن شاہ صاحب پر لکھنے والوں میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو چھان پھٹک کر بنیادی حقائق میسر کر سکتا۔ بیشک ڈاکٹر "سیموئیل جانسن" کے قد کاٹھ کا نہ بھی ہوتا لیکن تیکنیکی اعتبار سے کچھ تو معتبر ہوتا اور دلیلوں کے دان سے ان روایات کے خزانے کو قلم بند کرتا۔ انیسویں صدی کے وسط سے جن لوگوں نے اپنی ذاتی پسند کے حوالے سے جو روایات جمع کیں وہ تمام درویشوں اور فقیروں کی کرامات اور عقائد پر یقین میں ڈھل کر اپنا اصل رنگ و روپ پہلے ہی کھو چکی تھیں۔

مرزا قلیچ بیگ[3] کو عام طور پر شاہ عبدالطیف کی سوانح کے حوالے سے معتبر راوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میر عبدالحسین سانگی[4] نے بھی شاہ عبدالطیف بھٹائی کی زندگی کے واقعات جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ "دیا رام گدومل"[5] اور "لیلٰی رام وطن مل"[6] نے بھی شاہ بھٹائی کی سوانح لکھی ہے۔ ڈی جے کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر گربخشانی ہوتچند مولچند گربخشانی،[7] نے شاہ لطیف کی شاعری کے حوالے سے قابل قدر کام کیا۔ لیکن شاہ صاحب کی زندگی کے بارے میں وہ بھی پرانی روایات کے علاوہ کچھ نہیں بتا پائے۔ اور تو اور شاہ صاحب کی ازدواجی زندگی سے متعلق معلومات بھی چند روایتوں پر ہی مبنی ہے۔

یہ سب کے سب روایات پر متفق نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی، کسی روایات پر اعتراض کا ایک حرف نہیں اٹھاتا۔

کہتے ہیں کے شاہ لطیف کا خاندان ان کے بچپن میں کوٹری مغل کے گردونواح میں آکر آباد ہوا۔ جہاں ایک

---

[1] یہ مضمون انگریزی اخبار ڈان کراچی سے نومبر ۸۔ ۱۹۹۶ء کو اشاعت پذیر ہوا۔

[2] Sorley, HT.: Shah Abdul Latif of Bhit, 1940 & 1986 Sindh Kitab Ghar.

[3] احوال شاہ عبدالطیف بھٹائی 1900 شکارپور، 1972 حیدرآباد

[4] (لطائف لطیفی)

[5] Sigma (Daya Ram Gidumel, Something About Sindh, 1888, 1990

[6] Lila ram watanmil: The Latif,

[7] شاہ جو رسالو 1923ء اور 1985ء

معتبر گھرانہ آباد تھا۔ جسے شاہ لطیف کے والد شاہ حبیب کے ساتھ بہت گہری عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ اس گھرانے کے سربراہ مرزا بیگ کی بیٹی بیمار پڑ گئی۔ شاہ حبیب کے ہاں آدمی بھیجا گیا۔ اتفاق سے حبیب شاہ کی طبیعت بھی ناساز تھی، شاہ لطیف چوں کہ اس وقت نوجوان اور صاحب فضیلت تھے۔ اس لئے ان کے والد حبیب شاہ نے انہیں بھیج دیا۔ شاہ لطیف کو پردے میں بیٹھی مریضہ تک پہنچا دیا گیا۔ انھوں نے مریضہ کی انگلی چھو کر دعا دی۔ اور کمزور مریضہ کو افاقہ ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر شاہ لطیف نے ایک شعر بھی کہا۔ خاندان کے سربراہ کو ان باتوں کا جب علم ہوا تو شاہ لطیف کی عمر کا خیال کرتے ہوئے شعر کے معنوں میں پنہاں کسی ممکن تصور کے بارے میں سوچ کر انھیں بہت غصہ آیا۔ اور انہوں نے سید خاندان سے قطع تعلق کر لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی گزر گاہیں بھی بند کرادیں۔ تکالیف اس حد تک بڑھیں کہ شاہ حبیب کا خاندان وہاں سے قدرے شمال کی جانب منتقل ہوگیا۔ اسطرح دونوں خاندانوں کے درمیان مستقبل میں کسی تعلق کا کوئی امکان ہی نہ رہا۔

اسی روایت کے مطابق شاہ لطیف اس خفگی کی پیچھے موجود طوفان کی موجوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، ان کے دل میں جذبات نے آگ سی بھڑکا دی اور طبیعت کی بے چینی کے باعث انہوں نے گھر کو خیر آباد کہہ کر ویرانوں کا رخ کیا۔ شاہ لطیف جب تین سال کے بعد گھر لوٹے ان کے بے چین والد کو قرار ملا۔

وقت نے حالات کا رخ بدل دیا تھا۔ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے شاہ لطیف اور مرزا بیگ کو ایک بار پھر ایک دوسرے کے مدمقابل کر دیا۔ ایک دن مرزا بیگ کی حویلی کے تمام مرد گھروں سے باہر تھے کہ "دل" لٹیروں نے حویلی کو لوٹ لیا۔ عورتیں اور نوکر انھیں روک نہ پائے۔ مرد جب واپس لوٹے تو یہ معاملہ دیکھ کر پریشان ہوئے۔ مرزا بیگ غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے اور تمام لوگوں کو جوابی کاروائی کے لیے تیار کرنے لگے۔ شاہ لطیف نے یہ ماجرا سن کر اپنا فرض سمجھا کہ مرزا بیگ کی مدد کریں۔ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچے، تو مرزا بیگ نے نہ صرف ان کے ساتھ جانے سے انکار کیا بلکہ شاہ صاحب اور ان کے گروہ کا مذاق بھی اڑآیا۔

روایتوں اور کرامتوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ شاہ لطیف نے رنجیدہ ہو کر ایک شعر کہا جس میں پیشگوئی تھی کہ "بیگ کی معتبری اب رہنے کی نہیں۔ اب ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔"

مرزا بیگ اپنے آدمیوں سمیت مذکورہ تنازع میں ہلاک ہوگئے اور ان کے خاندان میں ایک بچے کے علاوہ کوئی بھی مرد نہیں بچا۔ خاندان کی بوڑھی عورتوں نے یہ تاڑلیا کہ سید گھرانے کے ساتھ ان کے مردوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے یہ آفت نازل ہوئی۔ لہذا دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کی کوششوں کے نتیجے میں شاہ لطیف کی شادی مرزا بیگ کی اس صاحبزادی سے ہوئی جس کو انہوں نے دعا دی تھی۔

شاہ صاحب کی شادی کے بارے میں مذکورہ روایت تاریخی طور پر کچھ کمی بیشی کے ساتھ قبول کی جا چکی ہے۔ اس کا ذکر تذکروں میں بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بزرگوں کے سوانحی تذکرے بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر "سورلے" اپنی کتاب میں شاہ لطیف کی شادی کا ذکر صرف ایک جملے میں کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ "شاہ لطیف کی شادی" ان کے پرانے دوست مرزا مغل بیگ کی صاحب زادی کے ساتھ ہوئی۔ بھائی کے دوست تنازع میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔[8]

ڈاکٹر سورلے اپنی معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں بتاتے۔ ان کی بات کو درست مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شاہ لطیف نے بڑی عمر میں شادی کی۔ کیونکہ اپنے (ہم عمر)

[8] Sorly, Shah Abdul Latif of Bhit

دوست کی بیٹی کے ساتھ شادی کی یہی صورت نظر آتی ہے۔ مذکورہ روایت کو اگر درست مان بھی لیا جائے تو کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مرزا بیگ، شاہ لطیف کے پرانے دوست تھے۔ کیوں کہ مرزا کے انتقال کے وقت شاہ لطیف کی عمر بائیس برس تھی۔ بیس سال کے نوجوان سے کسی کی دوستی کتنی پرانی ہو سکتی ہے؟ اور پھر مرزا صاحب کی صاحب زادی بھی اس وقت جوان تھیں۔ اور پردے میں تھیں اس سے بھی مرزا کی عمر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخص پورے خاندان کا سربراہ تھا۔ اور جس شخص کی صاحب زادی پردہ کرتی ہو وہ خود تو نوجوان نہیں ہو سکتا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی پیدائش ۱۱۰۲ھ کے لگ بھگ ہوئی۔[9] جب کہ مرزا کی وفات ۱۱۲۳ھ میں ہوئی۔ مذکورہ سن ہجری کا ذکر میر علی شیر قانع نے اپنی مشہور تاریخی کتاب "تحفتہ الکرام" میں بھی کیا ہے۔[10] میر علی شیر قانع کی پیدائش ۱۱۴۰ھ میں ہوئی۔ وہ شاہ لطیف کے دور کے آدمی ہیں اور بہت ہی معتبر اور مستند راوی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ شاہ لطیف کی شادی کے بارے میں درج بالا روایت کی تصدیق کرتے ہیں، جس کے بعد ڈاکٹر سورلے کا بیان کمزور ہو جاتا ہے۔ دوسری اہم معلومات مرزا کے نام کے حوالے سے ہے۔ ڈاکٹر سورلے نے مرزا کا نام "مرزا مغل بیگ" لکھا ہے۔ جبکہ میر علی شیر قانع نے "مرزا بیگ ارغون" لکھا ہے۔[11] سورلے نے اپنے ذرائع کا حوالہ نہیں دیا۔ علی شیر اس دور کے آدمی تھے اور انہیں تاریخی واقعات اور تاریخ گوئی سے رغبت تھی۔ ان کی معلومات پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ سورلے کو یہ گمان غالباً ڈاکٹر گربخشانی کے حوالے سے ہوا ہو گا۔[12] جنہوں نے میر عبدالحسین سانگی کے تذکرے سے متاثر ہو کر لفظ "مغل" لکھا ہے جس کے بارے میں کوئی بھی وضاحت نہیں دی ہے۔ وہ صرف یہ لکھتے ہیں کہ "مروی ست" یعنی روایت ہے۔

میر عبدالحسین سانگی نے شاہ لطیف کی زندگی سے متعلق روایات جمع کر کے انہیں فارسی میں منظوم کیا۔ اس خاص روایت میں انہوں نے خاندان یا خاندان کے مردوں کے لئے لفظ "مغل" اور مغلان کا استعمال بار بار کیا ہے۔[13] ایک سے زائد مرتبہ انہوں نے "مرزا بیگ" کو نام کے طور پر بھی لکھا ہے۔ لطائف لطیفی میں انھوں نے "مرزا بیگ" کو شخصی نام کے طور پر لکھا۔ کتاب کے ضمیمہ میں بھی انہوں نے "مرزا بیگ"[14] کو نام کے طور پر بھی لکھا ہے۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب وہ لفظ مغل یا مغلان استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد قوم، نسل اور ایک جداگانہ تشخص کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ انہوں نے کسی فرد کے شخصی نام کے طور اس لفظ کو کہیں بھی استعمال نہیں کیا۔ تحفتہ الکرام[15] میں مرزا بیگ ارغون واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ ہے اوائل بیسویں صدی کے عالموں نے لفظ "مغل" کو اتنی اہمیت کیوں دی کہ اسے نام کے جز کے بجائے اصل نام بنا ڈالا۔ جبکہ لفظ "مغل" کے حق میں کوئی اور قابل توجہ حوالہ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ لہٰذا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ میر عبدالحسین سانگی کی نظم کے زیر اثر رہنے والے عالموں بشمول سورلے اور "گربخشانی" نے مرزا بیگ کے نام کو یہ صورت دی۔

شاہ لطیف کی زندگی پر تحقیق کرنے والے علما سانگی کے شعروں کے سحر میں ایسے گرفتار ہوئے کہ مغل اور مغلان کی گردان نے انہیں لفظ "مغل" کو مرکزی حیثیت دینے پر مجبور کر دیا۔ اور بعد میں علماء نے بغیر کسی حیل وحجت کے اس نکتے کو قبول کر لیا۔ لہٰذا سورلے اور "گربخشانی" جیسے معتبر محققین کی تحریروں کی موجودگی میں باقی سب

---

[9] شاہ جو رسالو: ڈاکٹر نبی بخش خان، شارح عبداللہ شاہ پورو ص38

[10] تحفہ الکرام۔ سندی ست صفحہ388 اور دیکھئے تذکرہ مقالات الشعراء ص429

[11] تحفتہ الکرام (فارسی)۔

[12] گربخشانی: شاہ جو رسالو ص-15

[13] سانگی، لطائف لطیفی، ص66-16

[14] سانگی ص104

[15] قانع: تحفتہ الکرام (فارسی) ص152

لوگ بھی "مرزا مغل بیگ" لکھتے رہے اور نام کے اہم ترین حصے کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کی مدد سے مرزا خاندان کی مزید شناخت ہو سکتی تھی۔ لفظ مغل نے تو شناخت کو مزید عمومی حیثیت کی جانب دھکیل دیا۔ جس کے نتیجے میں مرزا کی تاریخ مزید مبہم ہو گئی۔ اس روایت کا زور دیکھئے کہ "پیر حسام الدین راشدی" مرحوم اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ جیسے محققین بھی میر علی شیر قانع کی معروف کتب " مقالات الشعراء "اور "تحفتہ الکرام " کی ایڈیٹنگ کرتے ہوئے مرزا بیگ ارغون کے نام میں لفظ "مغل" کا اضافہ کرتے ہوئے "ارغون "جیسی قبائلی پہچان کو بے وجہ ختم کر دیتے ہیں وہ یہ سمجھے کہ شاید میر علی شیر قانع کی کتب کے نسخوں میں غلطی سے پورا نام درج ہونے سے رہ گیا ہوگا۔[16] سندھ ادبی بورڈ ص 388 میر علی شیر قانع: تذکرہ مقالات اشعراء (تصحیح و حواشی سید حسام الدین راشدی) سندھی ادبی بورڈ 1957ء ص 429) درحقیقت یہ بہت بڑا قدم ہے۔ جو کہ عمومی حالات میں تاریخ دان اس وقت تک نہیں اٹھا سکتے۔ جب تک کہ حقائق واضح نہ ہوں اور تمام عوامل کی معتبر شہادتیں میسر نہ ہوں یا دیگر مستند نسخوں سے ایسے گمان یا حقیقت حال کا یقین نہ ہو جائے اور ترمیم یا تحریف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ ایسے میں ان تمام عوامل کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے یہ قدم اٹھایا جاتا، لیکن افسوس کہ یہاں ایسی کوئی صورت حال دکھائی نہیں دیتی اور پھر خاموشی سے نام میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ کوئی بحث نہیں ہوتی۔ اسباب نہیں بتائے جاتے۔

اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا کہ جب ڈاکٹر غلام علی الانہ "بیگلار قبرستان " گئے وہاں موجود قبروں کا تفصیلی جائزہ لیا تو وہ مرزا بیگ کی قبر پہنچاننے سے قاصر رہے۔ جیسا کہ وہ بیگلار نامہ کے ترجمے کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔ کہ انہوں نے "قبرستان کو گھوم پھر کر دیکھ لیا، اور مطالعہ بھی کیا [17] لیکن وہ بھی وہاں موجود کسی غیر معمولی شخصیت کی قبر کو پہچان نہ پائے، یہ اس لئے ہوا کہ "مرزا بیگ ارغون" کا نام اب "مرزا مغل بیگ "جو بن چکا ہے۔" جب تاریخ اور ادبی تحریروں کا یہ عالم ہو اور مستند نسخوں میں ایسی ترامیم ہو چکی ہوں، غلط مندرجات نہ صرف قبول کر لیے گئے ہوں بلکہ معروف بھی ہو چکے ہوں تو تصحیح ممکن ہی نہیں رہتی۔[18] ماسوائے اس کے کہ معجزانہ طور پر ایسا کوئی معتبر قلمی نسخہ اچانک سامنے آجائے، یا آثار قدیمہ سے متعلق شہادت مل جائے جو کہ متعلقہ معلومات واضح طور پر فراہم کر سکے۔ اور ایسے واقعات کی خبر عوام میں تجسس پیدا کر دے۔ جس کے نتیجے میں پرانے حقائق نیا روپ دھار لیں۔

بیگلار قبرستان میں ایک قبر دریافت ہوئی ہے جس نے ہماری ادبی اور تاریخی کتب میں تسلسل کے ساتھ ہونے والی غلطیوں میں تصحیح کو ممکن بنا دیا ہے۔ مذکورہ قبر بناوٹ میں ارغون۔ ترخان روایات کی امین ہے۔ ایک اونچے چبوترے پر بنائی گئی یہ بیگلار خوانین کی قبروں کے مرکز سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔ "توری" کا یہ مشہور قبرستان ٹنڈو اللہ یار۔ ٹنڈو آدم سڑک کے قریب "میوں وہیوں" کے مزار کے قریب ہی واقع ہے۔ ثلث و نستعلیق خط میں عبارتوں کے علاوہ اپنے دور کی روایتی سجاوٹ سے آراستہ یہ قبر اپنے دور کا خوبصورت نمونہ ہے۔ قبر کے سرہانے کلمہ طیبہ کی عبارت ہے۔ اور جنوبی سمت قبر کا کتبہ ہے جو ہماری تاریخی غلطیوں کی درستگی کیلئے واضح عبارت

[16] تحفتہ الکرام (تصحیح و حواشی ڈاکٹر بلوچ سندھی ترجموں، مزید دیکھئے میر علی شیر قانع، تذکرہ مقالات الشعراء، تصحیح و حواشی سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ 1957-ص 429

[17] ادراکی بیگلاری: بیگلار نامہ (سندھی)۔ ص 3

[18] Hamid Ali & Dr. Ahmed Nabi khan "graveyard of Miyoon wahyoon" in Pakistan archeology No 7.

پیش کر رہا ہے۔ کتب کے مطابق صاحب قبر مرزا بیگ ارغون ہیں۔ یہ دیکھ کر فوری طور پر ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ یہ اسی تاریخی شخصیت کی قبر ہے۔ یا کسی اور مرزا بیگ کی ۔جہاں تک محل وقوع کا تعلق ہے تو"سوئی قندر"یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ جہاں شاہ لطیف کی ولادت ہوئی تھی۔"کوٹری" جھاں مرزا بیگ مقیم تھے یہاں سے گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔اور ھالاحویلی چار میل دور ہے۔ ایسے میں "بیگلار قبرستان" کے علاوہ کوئی اور ایسی موزوں جگہ نظر نہیں آتی جہاں مرزا بیگ کا مدفن ہوسکتا ہو۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیگلار خاندان کے ساتھ ارغون گھرانے کے قریبی روابط کا دائرہ "سمرقند"تک جاتا ہے۔[19]

اور یہ بھی ایک جانی پہچانی ریت ھے کہ سماجی طور پر معتبر لوگوں کا مدفن ویسے بھی امیروں اور حاکموں کے پہلو میں ہی ہوتا ہے۔

ایسے محدود اور مخصوص علاقے میں کسی اور مرزا بیگ ارغون کا ہونا قریب ازقیاس نہیں۔ یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ "ممکن ہے کہ ایک ہی نام کے دو اشخاص ایک ہی قبیلے میں پیدا ہوئے ہوں "اس کا ممکنہ جواب ہے

ہوسکتا ہے کہ ان کا ایک ہی وقت میں ہونا اگر ممکن ہے تو دونوں کی وفات ایک ہی سال میں ہونا امکان سے باہر ہے۔ ویسے بھی تمام تاریخی وادبی ذرائع کسی دوسرے مرزا بیگ ارغون کا ذکر نہیں کرتے۔اور جس

امیرانہ ٹھاٹھ اور شان کی گواہی قبر دے رہی ہے ویسا کوئی اور شخص نہیں سنا گیا۔

ویسے بھی اس ضمن میں سب سے اہم بات مرزا بیگ کی تاریخ وفات ہے۔جو سب تذکروں میں دی گئی ہے۔ یہ تاریخ وفات ان سے مماثل ہے جو تاریخی تذکروں میں دی گئیں ہیں۔ یعنی ۱۱۲۴ھجری۔ ایک سے زیادہ تذکروں میں آیا ہے کہ جب مرزا بیگ کی وفات کی خبر شاہ لطیف کی مجلس میں پہونچی تو ایک مصاحب نے کہا۔ "بود خبیث " جس سے وفات کا سن ۱۱۲۴ ھجری بنتا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا اس طرح کہنا مناسب نہیں۔ اس کی جگہ پریوں ہونا چاہئے " یک مغل سے بودہ" ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم نے شاہ جو رسالو میں شاہ لطیف کی سوانح سے متعلق ذکر میں بھی یہی مادہ تاریخ رقم کیا ہے۔ لیکن اس مادہ کی تحریر میں بلوچ صاحب سے البتہ سہو ھوا، انھوں نے" بودہ" کی جگہ پر "بود" تحریر کیا۔ جس سے سن ۱۱۱۹ ھجری بنتا ہے جبکہ سب جگہ پر "یک مغل سے بودہ" سن وفات ۱۱۲۴ ھجری ہی ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ایک مغل سے بود"۔

[20] اس مشہور قصہ سے ایک بات تووثوق سے ظاہر ہوتی ہے کہ مرزا بیگ ، جن کی صاحبزادی شاہ لطیف کہ عقد میں آئی وہ ۱۱۲۴ ھجری میں فوت ہوئے ۔[21] چونکہ حال ہی میں دریافت ہونیوالی مرزا بیگ ارغون کی قبر پر بھی تاریخ وفات ۱۱۲۴ ھجری درج ہے۔ اس لیئے اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہتاکہ یہی وہ مرزا بیگ ارغون ہیں جن کا ذکر "تاریخی ونیم تاریخی"کتب میں آیا ہے۔

پتھر سے بنی یہ خوبصورت قبر درمیان سے دو لخت ہوچکی ہے اور جگہ جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑی

---

[19] Kaleem Lashari," Mirza Mughal Baig or Mirza Baig Arghun (father in law of shah Abdul Latif) Through Historical & Archaeological & I dence", in the Archaeological Review 1997-98 ,pp 101-126)

[20] ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ شاہ جو رسالو: سمجھانی اور معنوم سمیت شارخ ڈاکٹر عبدالغفار سومرو۔ سندھی ادبی بورڈ جامشورو۔2016ص ۸۳مزید دیکھئے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، شاہ جو رسالو۔ شاہ جو کلام جلد پھریوں۔ بھٹ شاہ ثقافتی مرکز1989ء- ص3-22

[21] میر علی شیر قانع ٹھٹوی۔ تذکرہ مقالات شعراء۔ تصحیح سید حسام الدین راشدی۔ سندھی ادبی بورڈ(کراچی) ۱۹۵۸ء، ص ۳۲۹

ہزارے کا ہندکو ادب (ایک اجمالی خاکہ)

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

سبھی جانتے ہیں کہ ''ادب'' کیا ہوتا ہے اور اس کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ جی ہاں! ادب کسی بھی زبان کا سرمایہ ہوتا ہے جس کی تقریباً ہر زمانے میں اہلِ علم و دانش نے اپنے اپنے علم اور تجربے کے مطابق تعریف وتشریح کر رکھی ہے۔ ادب کے لغوی معنیٰ کو دیکھیں تو یہ کسی بھی زبان کا وہ علم ہے جس میں نحو، لغت، عروض، انشاء معانی اور بیان شامل ہوتا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں دیکھیں تو ان نثری و شعری شذرات، تخلیقات اور فن پاروں پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں کسی معاشرے کی اجتماعی زندگی کی عکاسی اور ہر شعبہ زندگی کے بارے میں سماجی تقاضوں کے پیشِ نظر بحث کی جاتی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں اگر ہم ہزارے میں ہندکو ادب کی بات کریں تو سب سے پہلے ہمیں اس جانب دیکھنا پڑتا ہے کہ ہندکو جو کہ صدیوں پرانی زبان کے طور پر جانی جاتی ہے، اسکا سارا ادبی خزانہ لوک ادب کی صورت میں چلتا آیا جو کہ ابھی تک اپنی مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ اس لوک ادب کی سب سے مستحکم اور مشہور اصناف تو ماہیا اور چار بیتا تسلیم کی جاتی ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ حرفی، کافی، اور گیت بھی ہندکو لوک ادب کی معروف اصناف سمجھی جاتی ہیں اور ان کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہندکو بولنے والوں میں سے بہت سوں کو زبانی یاد بھی ہے لیکن کسی کو ان کے شاعر یا تخلیق کار کے بارے میں مصدقہ علم کم کم ہی ہوتا ہے، تاہم کچھ چار بیتے ایسے بھی ہیں جن کے شاعر کا نام بھی ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ ہندکو زبان کی خوش قسمتی جانیے کہ اب ہزارے میں ہندکو تحریری ادب سامنے آنا شروع ہو چکا ہے جو کہ اس زبان کو زندہ رکھنے کی عمدہ کوشش گردانی جاتی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر بشیر احمد سوز اپنی کتاب ''ہزارہ میں ہندکو ادب کی تاریخ'' میں تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ یہ کتاب ہندکو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک اچھا حوالہ ہے۔

یہاں مختصراً ہزارے میں ہندکو ادب کے حوالے سے بات کی جائے تو پچھلے ساٹھ ستر سالوں سے اس کی ترویج و ترقی کے اچھے خاصے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ یوں تو ہزارے کا شاید ہی کوئی شاعر و ادیب ایسا ہو جس نے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندکو میں کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو، تاہم وہ سارا ادبی خزانہ سرِ دست دستیاب ہونا اور اس پر کوئی تفصیلی بات کرنا کئی وجوہات سے ناممکن ہے کیوں کی اس کام کے لیے ایک مکمل تحقیقی، تدوینی اور اشاعتی کاوش کی ضرورت ہے۔ لہذا اس مضمون کا دائرہ بحث راقم کی حد تک دستیاب کتب، شخصی معلومات اور مواد تک محدود سمجھا جائے۔

ہزارے کے تحریری ہندکو ادب میں مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے پہلے ملک عبدالغفور صاحب کا کیا ہوا قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ آتا ہے۔ یہ ترجمہ ہزارے کے ایک بڑے لکھاری کا اپنے دین سے گہرا لگاؤ اور محبت ظاہر کرتا ہے اور ہندکو لکھنے بولنے اور سمجھنے والوں کے لیے ایک تحفے کی طور پر موجود ہے۔

اس کے بعد بات کرتے ہیں غزل کی جو کہ نہایت خوبصورت اور ہر دل عزیز صنف سخن کے طور پر صدیوں سے جانی پہچانی جاتی ہے اور کئی زبانوں میں موجود ہے۔ ویسے تو سنتے آئے ہیں کہ غزل کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی مگر آگے چل کر فارسی، ہندی اور اردو کے شعرا نے اس صنف میں عمدہ نمونے پیش کیے۔ ہندکو میں غزل اردو کے اثرات لے کر ہی آئی اور مضمون، خیال، تشبیہ، استعارا، قافیہ، ردیف، بیان، صنائع، بدائع اور عروض وغیرہ کے حوالے سے اردو غزل کے شانہ بشانہ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ پھر ہندکو کا اپنا روزمرہ اور محاورہ اور گہرا ثقافتی وسماجی پس منظر اس کی الگ پہچان بن کر سامنے آتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں بہت سی مثالیں مختلف شعرا کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہیں مگر طوالتِ مضمون سے بچنے کی خاطر نمونے کے طور پر صرف دو پرانی غزلوں کے دو دو اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

عشق تیرے بچ جھلی ہو کے گلی گلی پئی رُلنی آں۔۔۔۔ جدھروں تیری واپئی آوے ادھرای پئی چلنی آں

دیساں بچ پردیسی دِسے اج پرواز نمانڑاں وی۔۔۔۔ میں ڈھلدے پرچھاویں دیخ کے انجو پئی پہلنی آں۔۔ الطاف پرواز

(اردو ترجمہ: ا۔ تیرے عشق میں پاگل ہو کر گلی گلی رُل رہی ہوں، جہاں سے تیری ہوا آنے کا احتمال ہے اسی طرف جا رہی ہوں۔

۲۔ آج پرواز بیچارا اپنے دیس میں بھی پردیسی لگ رہا ہے۔ میں تو ڈھلتا سائیہ دیکھ کر یوں ہی دھوکہ کھا رہی ہوں۔

جس دا بھی بس چلیا، کیتا فرق نہ رات دیہاڑی۔۔ اُس ٹکیا نیہہ بُوٹا اتھے، جساں لہ نی نیہہ کوہاڑی

کے نال ایہہ ڈوگیاں بنیاں، کے نال کھلاڑے۔۔ باجھ کموں، مجبور! اے بنجر کے میرا کے

باڑی۔۔۔اسرائیل مہجورؔ

(اردو ترجمہ: ا۔ یہاں جس کا بھی بس چلا اس نے رات دن کوئی توقف نہیں کیا۔ صرف اسی نے درخت نہیں کاٹا جس کو کلہاڑی نہیں ملی۔

۲۔ محنت ہی کھیتی باڑی سے اناج کا حصول ممکن بناتی ہے۔ مہجور! محنت کے بغیر ہر قسم کی زمین بنجر ہی رہتی ہے۔

ہزارے میں ہندکو غزل گو شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جو سابقہ چھے سات دہائیوں سے اس میدان میں اپنی اعلیٰ اور بانکی شان رکھتے ہیں۔ جن میں الطاف پرواز، عبدالغفور ملک، محمد اسرائیل مہجورؔ، مقرب آفندی، رشید ہزاروی، عبداللطیف راہی، سلطان سکونؔ، شریف حسین شاہ، صوفی عبدالرشید، پرواز تربیلوی، پروفیسر آصف ثاقبؔ، سعید تازؔ، کرنل فضل اکبر کمالؔ، نیاز سواتی، مسکی میرٹھی، جعفر سید، پروفیسر یحییٰ خالدؔ، حیدر زمان حیدر، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، شاہ نواز سواتی، فاروق احمد قریشی، منظور تربیلوی، عبدالخالق شاطر ہزاروی، پروفیسر محمد فرید، پروفیسر بشیر احمد سوزؔ، محبوب الٰہی عطاؔ، اکرم درویش، نذیر حسین کسیلوی، ساجد حسین ساغرؔ، قاضی سیف الرحمان سیفؔ، صدیق منظرؔ، مسماۃ پروین سیف، افتخار ظفر، احمد حسین مجاہدؔ، امتیاز الحق امتیاز، ڈاکٹر ضیاالرشید، عبدالوحید بسملؔ، حفیظ عاجزؔ، پروفیسر ناصر داؤد، شعیب آفریدی، منیر حیدر، وحید قریشی، قاضی ناصر بختیار، شکیل اعوان، جمیل انور، سید ازہر بخاری، نقاش اختر، اجمل نذیر، اختر زمان اختر، نیازت علی نیاز، عرفان تبسم، اشرف راہی، مختار آسی تنولی، ساجد سواتی، الطاف ترہابالوی، جہانگیر جلال، یونس مجاز، اسماعیل ساغر لبڑکوٹی۔ غلام محمد اسیر لبڑکوٹی، سید سکندر شاہ۔ محمد ریاض، نثار احمد ناصرؔ، لطیف خان اُتمان زئی، نیک محمد، عظمت علی کیانی، عقیل احمد قریشی، محمد ابرار خان جدون، ارشد نواز، محمد افتخار گوہر، ارشد علی، منظور خان، محمد علی پاشا، نعمان احمد نعمان، محمد عظیم ناشادؔ، شہزادہ سلیم ارم، ایم وحید جدون، محمد شفیق اعوان، احمد ریاض، قاضی واجد خان، سعید گل شیر پوری، راجہ فیصل، فصیح الدین فصیحؔ، جلیل احمد کمالؔ، منور سلطان، عاصم شہزاد، ابرار خان جدون، ایم نصیر آزاد، عامر محمود، ملک محمد رشید خیال، زرین نصرت، سید اقبال شاہ، شاکر بخاری، ظہیر احمد ظہیرؔ، ثوبیہ غزل، راجہ نیک محمد نایاب، مختار تنولی، ساجد حمید، خورشید احمد وفا، شوکت ساگر، رحیم سلطان مجاہد، احمد دین راشد، رمضان شیرازی اور پیر مطیع اللہ خان رجوعیوی کے علاوہ اور بھی کئی ہندکو شعرا کرام ہیں جن کا کلام ہندکو غزل کی صورت میں مختلف کتابوں، ادبی رسالوں اور اخبارات میں شائع ہو چکا اور ہوتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہزارے میں ہندکو غزل کے متعدد کتابی نسخے بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے جن کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ البتہ ان میں سے کچھ کتابوں کا حوالہ یہاں دیا جاتا ہے۔

''دکھ سنجھیالے'' یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں ہندکو ادبی سنگت ایبٹ آباد نے شائع کی جس میں سات شاعروں (پروفیسر آصف ثاقبؔ، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، افتخار ظفر، جعفر سید، سلطان سکون، پروفیسر محمد فرید اور پروفیسر یحییٰ خالد) کا کلام زیادہ تر غزلیں، کچھ نعتیں، ملی نغمے اور کچھ نظمیں شامل ہیں۔ اسی زمانے میں اس ادبی سنگت نے ہندکو غزل کی اور بھی کئی کتابیں شائع کرنے کا اہتمام کیا جن میں پروفیسر یحییٰ خالد کا شعری مجموعہ ''پیار پلکیے''، پروفیسر آصف ثاقبؔ کا ''اوہلے خواب خیالاں'' پروفیسر جعفر سید کا ''اوپرے گوشے'' پروفیسر محمد فرید کے ''سنجھ سویل'' اور ''برگی چھاں'' وہ مجموعے ہیں جن میں ہزارے کی ہندکو غزل کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہندکو ادبی جرگہ ایک اور ہندکو ادب کے نکھار کی تنظیم رہی ہے جس کی کوشش سے کچھ اور کتابیں شائع ہوئیں جن میں ہندکو غزل کے شاندار مجموعے ''سجرے پھل'' اور ''نین کٹورے'' شامل ہیں۔ ان سے ہٹ کر پرواز تربیلوی کی شعری کاوش ''پھل تے کنڈے'' اور ''لکھ تے لکھ'' پھر منیر حیدر کی ''سوچاں تے جگراتے''، سلطان سکونؔ صاحب کی 'دلسوٹھے'، صوفی عبدالرشید صاحب کی ''سوچاں دے سنگ''، کرنل فضل اکبر کمالؔ کی ''ٹہل سیوا'' پروفیسر محمد فرید کی ''چن لویلاں'' پروفیسر یحییٰ خالد کی ''سوچاں دی مندری'' پروفیسر بشیر سوزؔ کی ''سوچ منارے'' احمد حسین مجاہد کی 'تھندے خواب دی چھائی' امتیاز الحق امتیاز کی ''ادھی دعا''، قاضی ناصر بختیار کی 'چھکے بچ پھل'، راقم (عبدالوحید بسملؔ) کی ''کچے ڈاہلے پینگاں'' اجمل نذیر کی ''چٹی ددھ مٹھی کھنڈ''، ریاض طاہر کی ''چپ چپیتے'' لالہ محمد حنیف کی ''انگار'' سید نذیر حسین کسیلوی کی، ''مٹھا جل''، اختر زمان اختر کی ''دیوے تلے نہیرا''، شکیل اعوان کی ''ٹہاکیاں نے پھل'' نیازت علی نیاز کی ''کہنڑیاں سوچاں''، اکرم درویش کی ''سچے ویلے'' اور ریاض قاصر کا شعری مجموعہ بھی ہندکو شاعری کی ایسی کتابیں ہیں جن میں ہندکو غزل اپنے پورے جوبن اور لشکارے کے ساتھ ہندکو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو دعوتِ مطالعہ دے رہی ہے۔

کچھ پرانی غزلوں سے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے اُس وقت کی غزل کا مزاج اور زبان کا استعمال دیکھا جاسکتا ہے۔

فر غم دے جھکھڑ جھلے
سوہنڑے پھل مٹی بچ رُلے

جدوں یاد سجن دی آئی
اکھیاں بچوں اتھرو ڈُلھے
مینہ غم توں جندڑی چھٹدی
کوئی کیہڑے پاسے چُلّے
لا اکھیاں ملکؔ دیوانہ
اج یار دے غم بچ گھلّے

عبدالغفور ملک۔۔

اردو ترجمہ: ا۔ پھر غم کی آندھی چلی اور خوبصورت بھول مٹی میں مل گئے۔ ۲۔ جب ساجن کی یاد آئی، آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے

۳۔ غموں سے جان نہیں چھوٹتی، کوئی کس جانب چل کے جاں بچائے۔ ۴۔ ملکؔ دیوانہ محبت کر کے آج یار کے غم میں گھل رہا ہے۔

ہجرے مار مکائیاں اکھیاں
دید دیاں ترہائیاں اکھیاں
اکھیاں رت دے اتھرو روئیاں
یاد جدوں اوہ آئیاں اکھیاں
ہوٹھاں بھیت لکایا دل دا
کھول دتا مرجھائیاں اکھیاں
ہک پرواز وچھوڑے تیرے
ساری رات جگائیا ں اکھیاں

پرواز تربیلوی

اردو ترجمہ: ا۔ دید کی پیاسی آنکھیں ہجر کی سختی نے مار ڈالیں۔ ۲۔ میری آنکھیں خون کے آنسوؤں روئیں جب وہ آنکھیں یاد آئیں۔

۳۔ ہونٹوں نے پیار کا بھید چھپائے رکھا مگر مرجھائی آنکھوں نے کھول دیا۔

۴۔ پرواز! تیرے ایک بچھوڑے نے ساری رات سونے نہ دیا۔

روندیاں اکھیاں، اکھیاں لاوے
پانڑیں ڈوہل کے اگیاں لاوے
پہلے چوٹاں مارے دل تے
مٹھڑا بول کے پٹیاں لاوے
مندر بچ مصلےٰ ڈاہوے
مسجد بچ ٹُل ٹلیاں لاوے
چھوٹھا پیار جتاوے ثاقبؔ
مڑ مڑ سب نل جپھیاں لاوے

پروفیسر آصف ثاقبؔ

اردو ترجمہ: ا۔ روتے روتے آنکھیں لڑائے۔ پانی میں آگ لگائے۔ ۲۔ پہلے پھبتی کس کے دل جلائے پھر میٹھے بول سے مرہم لگائے۔

۳۔ مندر میں مصلےٰ بچھا لے اور مسجد میں جا کر گھنٹیاں بجائے۔ ۴۔ ثاقبؔ سب سے مڑ مڑ کر بغل گیر ہو کر جھوٹا پیار جتائے۔

جدوں پُچھ کے توں مُدے پچھو حال جُلدیں
اگ بجھی ہوئی نویں سرے بال جُلدیں
کدے ہسال جُلدیں کدے روال جُلدیں
چنگی ساڈے نل کھیڈ کھڈیال جُلدیں
ساڈی گل کدے سنڑی مینہ آ کن تہر کے
ایناں اپڑیاں ساریاں منال جُلدیں
کجھ گل تے ضرور اے سکونؔ سوہنڑیاں
جڑا توں نت ، بفے ، ڈھوڈیال جُلدیں

سلطان سکونؔ

اردو ترجمہ: ا۔ جب تم ایک مدت کے بعد میرا حال پوچھتے ہو تو بجھی ہوئی آگ نئے سرے سے جلا جاتے ہو۔

۲۔ عجب کھیل ہمارے ساتھ کھیلتے ہو کہ کبھی ہنسا جاتے ہو اور کبھی رلا جاتے ہو۔ ۳۔ ہماری بات کبھی کان دھر کے تو سنی نہیں بس اپنی اڑیاں منوا جاتے ہو۔

۴۔ کوئی بات تو ضرور ہے پیارے سکونؔ! جو تم روزانہ بفے، اور ڈھوڈیال جاتے ہو۔

(بفہ اور ڈھوڈیال دو قصبوں کا نام ہے جو ضلع مانسہرہ میں واقع ہیں۔ ان قصبوں کے ساتھ سکون صاحب کو بڑی محبت رہی ہے)

اُوپر پیش کیے گئے غزلیہ اشعار تقریباً پینتیس چالیس سال پرانے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ادب اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور ہر طرف ترقی کی دوڑ جاری رہتی ہے جس سے ادب بھی لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس اثر پذیری کا اندازہ لگانے کی خاطر اب موجودہ دور کی ہندکو غزل کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن کے پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہندکو غزل کے مزاج میں کوئی واضح تبدیلی نظری آتی ہے یعنی کہ یہ زمانے کے ساتھ چلنے کی صلاحیت رکھتی ہے یا اپنا وہی رخ اور مزاج لے کر چلی آ رہی ہے۔

پنڈ غماں دی چاواں کی
جند اوکھے بچ باہواں کی
کونڑ اے مڑے در بیٹھے دا
کہار ہنڑ مڑ کے آواں کی
ڈاہڈیاں در تے بول نہ ہکدا
میں لسیاں کو دباواں کی
لما ہے دنیا بچ مُچ پیکھ
مینگے چیڑے پاواں کی

محمد حنیف

اردو ترجمہ: ا۔ غموں کی گٹھڑی کیوں اٹھاؤں۔ مشکل میں جان کیوں پھنساؤں۔ ۲۔ کون ہے میرے انتظار میں، گھر واپس کس لیے آؤں؟

۳۔ طاقتوروں کے آگے تو بول نہیں سکتا، کمزوروں کو کیوں دباؤں۔ ۴۔ ابھی دنیا میں بہت

بھوک ہے، میں مہنگا لباس کیوں پہنوں

دکھاں دی پڑتال نہ کردا
آپڑاں آپ خیال نہ کردا
دس میں روگی کے بل ہوساں
پھکی کھانداں پال نہ کردا
اکھیاں ٹوٹ کے لماں پے داں
صدمے نال سوال نہ کردا
سنگیاں نال نہ ہووے سوہنڑاں
میسج کرداں ، کال نہ کردا

احمد حسین مجاہد

اردو ترجمہ: ا۔ نہ تو دکھوں کو پلٹ کر دیکھتا ہوں اور نہ ہی اپنا خیال آپ کرتا ہوں۔۲۔ بتا! میں بیمار کیا شفا پاؤں گا کہ دوائی کھاتا ہوں، پرہیز نہیں کرتا۔۳۔ آنکھیں موندھے لیٹا ہوں، دکھ کے مارے سوال نہیں کرتا۔۴۔ کہیں دوستوں کے ساتھ نہ ہو

پیارا، اسلیے میسج کرتا ہوں اسے کال نہیں کرتا۔

اج کل مچھیاں کوہ کے کھانیں
آئس کریماں تھو کے کھانیں
نمازاں پڑھنے دیہاڑی ویلے
راتی سئے کھوہ کے کھانیں
خوشیاں دی مٹھائی دی سنگیا!
مونہہ بچے دیئے رو کے کھانیں
بنڑیں بونہہ ایڈوانس وا سنگیا
پر بسکٹ یار ڈبو کے کھانیں

قاضی ناصر بختیار

اردو ترجمہ: ا۔ آجکل مچھلیاں ذبح کر کے کھاتے ہو اور آئس کریم بھی دھو کر کھاتے ہو۔۲۔ دن کو نمازیں پڑھتے اور رات کو لوگوں کے بھٹے توڑ کر کھاتے ہو۔۳۔ خوشی کے موقع پر مٹھائی بھی رو رو کر کھاتے ہو۔ ۴۔ بنتے تو بہت ایڈوانس ہو یار مگر بسکٹ چائے میں بھگو کر کھاتے ہو۔ (مزاحیہ)

دنیا، دولت، مال محبت
میرے خواب ، خیال محبت
اج ای اج اے محبت جو ہنگا
کل تے توں نہ ٹال محبت
عقلاں والے بنڑ نینھ سکدے
جھلے بنڑدے جال محبت
اوہی اکھ دا تارا ہوندا
ہوندی جس دے نال محبت
بونہہ ای اوکھا ساز اے بسمل
آپڑیں رخدی چال محبت

عبدالوحید بسمل

اردو ترجمہ: ا۔ محبت ہی میرے لیے دنیا کی ہر چیز کے برابر ہے۔ محبت ہی میری سوچ وفکر ہے۔۲۔ محبت تو ہر دستیاب لمحے کا تقاضا ہے اسے ٹوکل پر نہ ٹال۔ ۳۔ زیادہ سیانے محبت کا جال نہیں بن سکتے یہ کام تو جنونی ہی کیا کرتے ہیں۔۴۔ وہی آنکھ کا تارا بنتا جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔۵۔ محبت ایک ایسا ساز ہے جس کا سیکھنا اور بجانا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کا اپنا ہی رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا اشعار جس رنگ غزل کی نمائندگی کر رہے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندکو ادب میں غزل خوب ارتقائی منازل طے کرتی آ رہی ہے جو ہر قسم کے مضامین، خیالات، جذبات ، مشاہدات ، تجربات اور قلبی واردات کے بیان کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کی اچھی خاصی گنجائش ہی نہیں بلکہ مکمل طور پر ہر وقتی تبدیلی کو اپنے اندر سمونے اور پرونے کی طاقت اور سلیقہ بھی رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب ہزارے کے ہندکو ادب کا دامن اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اسمیں شب و روز مختلف انواع کے خوبصورت پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں جن کی خوشبو دور دور تک محسوس کی جا سکتی ہے۔

غزل سے ہٹ کے نظم کی بات کریں تو ہمیں ہندکو کے بنیادی لکھاریاں میں محترم سلطان سکون ، پروفیسر محمد فرید۔ پروفیسر آصف ثاقب، کرنل فضل اکبر کمال، جعفر سید، پروفیسر یحیٰی خالد، پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کی نظمیہ شاعری سے واسطہ پڑتا ہے ۔ اور پھر جناب واحد سراج، احمد حسین مجاہد، امتیاز الحق امتیاز، ڈاکٹر ضیا الرشید، قاضی ناصر بختیار، اجمل نذیر، جاوید اختر امن ، احمد ریاض، اختر نعیم، شکیل اعوان، نیازت علی نیاز اور اختر زمان اختر کی نظمیں ہندکو ادب کا سرمایہ بن کے سامنے آتی ہیں۔ راقم السطور کو بھی اس حوالے سے انگلی کٹا کے شہیدوں میں نام لکھانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

ہندکو شعری ادب کی دیگر اصناف پر بات کریں تو ہمارے نامور شعرا نے تقریباً ہر صنف میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی بھرپور کوشش کر رکھی ہے۔ جناب مجاہد اور قاضی ناصر بختیار نے مثنوی کی صنف پر خاص توجہ دی اور پھر بہت ہی خوبصورت دو کتابیں جن میں سے ایک کا عنوان ''مدینے دی ہجرت'' اور دوسری کا ''قینچی'' ہے، ہندکو ادب کا قیمتی سرمایہ بنا کے پیش کیں ۔ اسی طرح، رباعی، قطعہ، حرفی، ترکہ، چوبولہ، سٹھڑیں، چار بیتہ، ماہیا اور دوہا وغیرہ ، بھی ہزارے کے ہندکو ادب میں خاص اہتمام اور شوق سے لکھے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ''کچے ڈھلے پہینگاں'' میں نثری نظم بھی موجود ہے، پھر حمد باری تعالیٰ، نعتِ رسول مقبولؐ، سلام، منقبت، ملی شاعری، طنز و مزاح اور منظوم تراجم بھی ہزارے کے ہندکو شعری ادب کی خاص پہچان بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر ہم

ہزارے کے ہندکو ادب کا اندازہ لگائیں تو، حمد، نعت، سلام، ملی نغمے، غزلیں، نظمیں اور قطعے تقریباً ہر شاعر کی کتاب میں موجود ہیں جب کہ حرفی، ترکہ، چوبولہ، سٹھڑیں، چاربیتہ، دوہا اور ماہیا کچھ مخصوص دوستوں نے اپنی اپنی کتابوں کی زینت بنا کر پیش کئے ہوئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندکو زبان اور ادب کسی بھی دوسری زبان کا ہر میدان میں اچھا خاصا مقابلہ کرنے کے قابل ہے۔

ہزارے کے ہندکو ادب میں نثری کاوشوں کی بات کی جائے تو سب سے پہلے حیدر زمان حیدر صاحب کا کیا ہوا قرآن شریف کا ہندکو ترجمہ سامنے آتا ہے پھر ہندکو میں سیرت نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نویسی، افسانہ نگاری، لغت نویسی، ترجمہ نگاری، داستان نویسی مزاح نگاری اور مثل نویسی (کہاوتیں لکھنا) بھی یک عرصے سے جاری ہے اور اس حوالے جو کتابیں نظر سے گذریں ان میں سیرت پاک کے باب میں پروفیسر یحیٰی خالد کی ''رحمت اللعالمین'' پروفیسر ناصر داؤد کی ''غزوات نبوی'' لغت نگاری میں جناب سلطان سکون کی ''ہندکو اردو لغت'' نذیر حسین کسیلوی کی ''نذیر اللغات'' ناول نگاری میں سید ماجد شاہ کا ناول ''بلدا دیوا'' افسانوی ادب میں پروفیسر یحیٰی خالد صاحب کے افسانوی مجموعے'' گلیاں تے درنڈے'' اور'' چونڑویں افسانے'' ڈاکٹر عادل سعید قریشی کا افسانوی مجموعہ'' سوری'' ترجمہ نگاری میں سیدہ مفیدہ ماجد کا'' راجہ پورس'' امتیاز الحق امتیاز کا'' علامہ اقبال کی منتخب نظموں کا ہندکو منظوم ترجمہ'' مثل نویسی میں سلطان سکون صاحب کی ''ہندکو ضرب الامثال'' اور'' گوزے بچ دریا'' داستان نویسی میں سلطان سکون صاحب کی ''چنو چوھدویں رات''، قاضی ناصر بختیار خان اور پروفیسر ناصر داؤد کی ''ہندکو لوک کہانڑیاں'' ڈرامہ نگاری میں راقم الحروف کی تصنیف ''کھیڈاں'' (جس کا اردو ترجمہ بھی ڈاکٹر محسین بی بی کی نوک قلم سے نکل کر ''کھیل'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکا ہے)۔ ایسی تصانیف ہیں جو ہزارے کے ہندکو ادب کو ایک خاص مقام دینے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور جناب حیدر زمان حیدر (مرحوم) جو کہ ہزارے میں ہندکو کے پہلے پہلے لکھاریوں میں سے ایک ہیں، کی تصانیف، ''ہندکو چاربیتے دے رنگو رنگ ندارے''، ''مثال''، ''سوداگر اس بازار دا'' اور ایک سفرنامہ اور جناب سلطان سکون کی ہندکو اردو ڈکشنری اور ہندکو ضرب الامثال پر مشتمل دو مجموعے بھی ہندکو ادب کی آبیاری کا کام کرتی آ رہی ہیں۔

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہزارے کا ہندکو ادب اس لحاظ سے بھی اپنے پھلنے پھولنے اور ہزارے سے باہر بھی اپنی شناخت کرانے کی پوری ہمت اور اہمیت رکھتا ہے کہ اب بہت سے معروف اردو لکھنے والے احباب بھی ہندکو کی جانب متوجہ ہوئے ہیں اور نئے لکھنے والے شعرا و ادبا بھی اپنی ماں بولی سے خاص محبت رکھتے ہیں جن کی ادبی کاوشیں ہندکو کا ایک نیا انداز اور ولولہ لے کر سامنے آ رہی ہیں جس کی بنا پر قوی امید کی جا سکتی ہے کہ ہزارے کے ہندکو ادب کا مستقبل نہایت روشن اور شاندار ہوگا۔ (ان شاءاللہ)

جلا کر ہم کی نگری، نگر آباد کیا کرنا
جو گزرے شاق نسلوں پر وہ لمحہ یاد کیا کرنا

بتا کر عمر ساری ہم یہ نکتہ آج سمجھے ہیں
جسے زنداں سے رغبت ہو اسے آزاد کیا کرنا

حسینوں پر یہ تہمت ہے کہ دل برباد کرتے ہیں
جو خود برباد ہوتا ہو اسے برباد کیا کرنا

رویوں کے تصادم سے چھلک پڑتے ہیں پیمانے
کسی کی کج کلامی پر کوئی بیداد کیا کرنا

سہارا وہ سہارا ہے کہ تھامے ہاتھ مشکل میں
کسی جھوٹے سہارے کا پس افتاد کیا کرنا

غرورِ حسن کی شدت نے توڑا پیار کا رشتہ
دوبارا جوڑ کر اس کو، دلِ ناشاد! کیا کرنا

بڑے بھولے ہو تم لبنیٰ کبھی ایسا بھی سوچا ہے؟
اجاڑا جس کو جاناں نے وہ دل آباد کیا کرنا

بہ یاد: سید قاسم محمود
شاہکار علمی، ادبی اور فکری تحاریر کا مجموعہ
ماہنامہ بک ڈائجسٹ
Book Digest لاہور پاکستان
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: منظہر سلیم مجوکہ — مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زر تعاون مبلغ -/2500 روپے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
برائے خط و کتابت / ترسیل زر رابطہ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

ترک چانداور فصلِ بہار

اقصیٰ غزشین/ کوئٹہ

یونہی کل بیٹھے بٹھائے ہماری ماموں زاد، جو ترکی زبان سمجھ بول لیتی ہیں، اچانک بول اٹھیں، کہ ترک سورج مکھی کو 'چاند کا پھول' کہتے ہیں. بس پھر کیا تھا پورے خانوادے کو گفتگو کا موضوع مل گیا۔ ہم نے کہا، فارسی میں آفتاب گردان یعنی سورج کے گرد گھومنے والا ہے اور عربی کی ادوار الشمس بھی یہی ہے۔ والد صاحب بولے، سلیمانی بلوچی میں غالبًا روشِ پل، یعنی دن کا پھول کہیں گے۔ اچانک خیال آیا پشتو کا 'لمر گل' کے لفظی معنی بھی تو سورج کے پھول کے ہیں۔

رات بھر ترکوں کے چانداور سورج کے معشوق پھول کے بارے میں سوچتے پڑھتے رہے۔ پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ یہ ایک اور پھول ہے، جسے چاند سے ویسے ہی انسیت ہے جیسے سورج مکھی کو سورج. اور پھر سوچوں کا تانا بانا بنتا چلا گیا۔ کہ یہ چانداور سورج اور پھول، تعلق شاید کچھ اور گہرا ہو۔ تو صاحب ترک معاشرے میں چاند کو اُمیدِنو، نئے رنگوں، نئی شروعات اور خوبصورتی سے تشبیہہ دی جاتی ہے، تو عورت بھی چاند ہوئی اور اجالا کرنے والا رات کی تاریکی سے آزاد کرانے والا شجاع، سورج ٹھہرا۔

اور پھولوں، رنگوں، چمکتے سورج سے، اس خطے کا حسین جشنِ نوروز یاد آیا۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی، کہ ترک ایران وآذر بائیجان جیسے ممالک کے پڑوسی ہیں، کچھ نہ کچھ روایات تو انکی بھی ہونگی۔ ویسے تو نوروز کے دن تفریح کو نکلنا، قوسِ قزح اور آتش کو خوش بختی کی علامت سمجھنا، نوروز منانے والے تمام خطوں کا خاصہ ہے۔

البتہ اسکے علاوہ بھی ترک علاقوں میں بہار کی گوناگوں داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ جیسے فرخ نامی ایک نوجوان کا عشق میں مبتلا ہونا اور خاتون کے والد کے انکار سے بیمار پڑ جانا۔ حتیٰ کہ فرخ کی نظر جنت نظیر گلِ لالہ پر پڑتی ہے اور کچھ، 'اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا، کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور بیماری یہ جا، وہ جا۔

پھر اردگرد کے اور بہت سے علاقوں کی طرح داستانِ عنقا (پرندہ) بھی موجود ہے، جو طویل عمر گزرنے کے بعد، خود ہی جل کر خاکستر ہو جاتا ہے اور اسی خاک سے ایک نیا جنم لیتا ہے، یہ بھی تجدیدِ حیات کی علامت ہے۔

ترک علاقوں میں، بہار نامی ایک حسین دوشیزہ، جس کے رقص وسرود سے چڑیاں چہچہا اٹھتی ہیں، برف پگھل کر پھولوں کی راہ ہموار کرتی ہے، جا بجا درخت اپنی سر سبز تاب کے ساتھ لہلہاتے ہیں۔ جیسے بہار نامی یہ عورت، سراپا خوش کن سحر و جادو ہو۔

چاند سے خاص لگاؤ کی بات تو پہلے بھی ہو چکی ہے، اکثر ترک نوروز کا آغاز پہلے چاند کی جھلک اور چہل قدمی سے کرتے ہیں۔

پر صاحب کیا ہے نہ، ہم جیسے معاشرے میں رہتے ہیں، ہنستے ہنستے کوئی بات ایسی یاد آ ہی جاتی ہے۔ جب ترکوں اور غائبانہ طور پر ایران کے فارسی بانوں کی رنگوں، خوشبو، حسن، اور خوشیوں کا ذکر آیا تو نوروز کو اسی جوش وجذبے سے منانے والی ایک قوم یاد آ گئی۔ میں بہت لمبا چوڑا نہیں لکھوں گی۔ کرد مصنف احمد خانی کی میم وشین یاد آ گئی جو کرد علاقوں کے سیاسی بنیادوں پر تقسیم ہونے کے متعلق ہے۔ جسکا دیباچہ بجائے کسی حاکم کے خانی کے اپنے شعر سے ہے۔ خلاصہ کچھ یوں ہے کہ عثمانی وایرانی بحروں کے درمیان ایک خون کا بحر ہے جسے کردستان کہتے ہیں۔

متفرق خیال تھے لکھ دیئے گئے، سوچا کچھ اپنے عزیز ترک برادران کے رواجوں کا ذکر ہو جائے اور ساتھ ہی کچھ لوگوں کو میم وشین سے آگاہی ہو جائے۔

نوروز سے ذرا پہلے چہار شنبہ سوری، ایک قسم کی شب بدھ کی ضیافت منائی جاتی ہے۔ اس میں ایک مخصوص جملہ بولا جاتا ہے، 'سرخی تو از من، زردی من از تو' یعنی تیری سرخی (اے آگ) میری (صحت/خوش بختی) ہو جائے اور میری زردی تو لے لے۔ بس یہی جملہ اکثر بےچین کرتا ہے کہ اتنی مماثلتوں کے باوجود سرخ رنگ کو خوش بختی اور نئی زندگی کے بجائے موت اور بدبختی کا نشان کیوں بنا دیا گیا۔ اور اس خطے، اس نوروز منانے والے خون آلود خطے سے زیادہ بہتر سے سوال کہاں کے باسیوں سے کیا جاتا ہے۔ کاش ہم سب ایک دوسرے کی زردی کو اپنے دہکتے قرمز کا رنگ پہنانے والے ہوتے۔ بات واقعی نکلی تو دور تلک گئی۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر / لاہور

دورِ نو

چلنے لگا ہے دور شراب و کباب کا
شیدا ہے حکمران بھی لطفِ شباب کا
دیدار گل رُخوں کا بھی آسان ہو گیا
حامی رہا نہ جب سے زمانہ حجاب کا
رقص و سرود و محفلِ نغمہ گلی گلی
پھیلا ہے شور چار سو چنگ و رباب کا
میں کیا کروں یہ نسبتِ ساداتِ محترم
کرتے نہیں ہو کوئی عمل تم ثواب کا
کردار میں رچا نہیں جب فقرِ حیدری
لیتے ہو نام کس لیے تم بوترابؓ کا
کیا آخرت کی فکر ہو اُس کم نصیب کو
قائل نہیں ہے دل سے جو روزِ حساب کا

دورِ احتساب

آنا تھا وقت آ گیا آخر حساب کا
رونے سے ٹل سکے گا نہ لمحہ عذاب کا
دفتر کھلیں گے جرم و سزا کے تمام اب
ہوگا اب احتساب بھی عزت مآب کا
ملت فروش بچ گئے گر احتساب سے
غدارِ قوم ہو گا لقب پھر جناب کا
جب تک رہا، حجاب میں کچھ معتبر سا تھا
رہزن ہے نام آج اُسی بے حجاب کا
پہچان ہو گئی ہے لٹیروں کی دوستو
کچھ تو ہوا ہے فائدہ اس انقلاب کا
اسلام کے نظام کا کر دیجئے نفاذ
کوئی تو کام کیجئے آخر ثواب کا
"شوریٰ" نظامِ رحمتِ پروردگار ہے
مکر و فریب نام ہے اب انتخاب کا
کیوں منکرینِ ختمِ نبوت ہیں مقتدر؟
ہر شخص منتظر ہے تمہارے جواب کا
اس دور میں کریں گے عمل ہی کلام اب
اختر نہیں ہے دور فقط اب خطاب کا

پشاور کے معصوم شہیدوں کے نام

جو آرمی پبلک سکول پشاور میں دہشت گردوں کے حملے
کے دوران 16 دسمبر 2014 کو شہید ہو گئے

معصوم سے بچوں پہ گئے ظلم وہ ڈھا کر
مفرور ہوئے خوف ہر اک دل میں بٹھا کر
وہ پھول تھے جنت کے سجے باغِ ارم میں
رخصت ہوئے دنیا سے جھلک اپنی دکھا کر
ماں باپ محبت سے جنہیں ساتھ سلاتے
چھوڑ آئے اکیلا انہیں قبروں میں سلا کر
یہ دکھ کبھی لفظوں میں بیاں ہو نہیں سکتا
محسوس یہ اشکوں، کبھی آہوں میں کیا کر
ننھے سے سبھی دیپ بجھے موج ہوا سے
ہر دل میں گئے درد کی اک آگ لگا کر
یاد آئے مظالم ہمیں پھر کرب و بلا کے
ظالم وہ مناظر گئے عالم کو دکھا کر
ہو جائے نہ ٹھنڈا کہیں اب ناشتہ ان کا
لائے کوئی جلدی مرے بچوں کو بلا کر
بچوں کی طرح روتے ہیں ماں باپ تمہارے
کرتے ہیں تمہیں پیار تصور میں بُلا کر
یاد اُن کی رُلاتی ہے ہمیں خون کے آنسو
معصوم جو دنیا سے گئے خوں میں نہا کر
بھولے نہ کبھی ہم علی اصغر کی شہادت
رکھتے ہیں سدا یاد انہیں اشک بہا کر
لگتا ہے ابھی شمر کی اولاد ہے باقی
دم لیں گے مسلماں، انہیں دنیا سے مٹا کر
اب "ضربِ عضب" کی ضربات سے مٹ جائیں گے سارے
بیٹھے ہیں جو مجرم کہیں چہروں کو چھپا کر
دہشت کا سماں چھا گیا ہر سمت وطن میں
اب رب ہی رکھے ہم کو درندوں سے بچا کر
رونے سے کبھی لوٹ کے وہ آ نہیں سکتے
معصوم شہیدوں کے خدا، صبر عطا کر
کیا حرفِ تسلی کہیں ماں باپ سے اختر
جیتے ہیں شہیدوں کا جو غم دل میں بسا کر

ظاہر میں دیکھیے تو وہ مشعل بدوش ہیں
پرکھیں تو رہنما سبھی ظلمت فروش ہیں
رکھا ہے مبتلا ہمیں سحرِ کلام میں
لفظوں کا ایک ظاہری جوش و خروش ہیں
ہوتے ہیں بات بات میں اعدا کے ہمنوا
لگتا ہے جیسے اصل میں ملت فروش ہیں
اندھے ہیں دیکھ سکتے نہیں راہِ مستقیم
کلمۂ خیر کیا سنیں محرومِ گوش ہیں
بادہ و جام و رقص کے رسیا ہیں روسیاہ
وہ حامیانِ لہو و لعب نا و نوش ہیں
یہ کیا کھلائیں گے بھلا صحنِ چمن میں پھول
ویرانیاں ہی لائیں گے صحرا بدوش ہیں
اختر نہیں ہے ان سے کسی خیر کی اُمید
روشن خیال و گمرہ و محرومِ ہوش ہیں

ولی عالم شاہین/کینیڈا

تلوے کی مُردہ کھال

میرا خیال تھا
دنیا کو، دنیا کے راز کو
کافی کچھ میں جان چکا ہوں
لیکن جانی شے بھی
اک ان دیکھا اور بھیانک روپ بدل کر
میرے آگے تن جائے گی
اس کا ہرگز علم نہیں تھا
سوچتا ہوں دنیا کو میں نے کیا جانا ہے
پھر یہ سوچ کے
دنیا کے سب کام تو آخر نبٹانے ہیں
اپنے گھر سے نکل پڑتا ہوں

ویزا، ٹی وی، بجلی، پانی، گیس، اور فون
کے اتنے سارے ڈھیر بلوں پر
مہر لگاتی، باتیں کرتی
بینک کی خندہ جبیں کارندہ
دل کو اک بے نام خوشی سے بھر دیتی ہے
گھر آکر
پھر بیٹھے بیٹھے
غیر شعوری طور پہ، عادت سے مجبور
کھر چنے لگتا ہوں
اپنے نرم و گرم چشیدہ
وقت شکن تلوے کی مُردہ کھال

فیس بک

(Facebook)

ابھی اندھیرا ہے
یہ منہ اندھیرے مری جاگنے کی عادت نے
سکھا دیا ہے مجھے
کیسے روشنی کے بغیر
کدھر مڑوں میں دبے پاؤں
دھیان رکھتے ہوئے
کسی کی نیند نہ ٹوٹے
کوئی خلل نہ پڑے

کچن میں کون سی شے ہے کہاں تلاش کروں
دراز کون سی کھولوں
شکر ہے کون سے ڈبے میں کس میں کافی ہے
پھر اطمینان سے کافی کے ساتھ ٹوسٹ اور اخبار کو
سنبھالتا ہوں
مگر قریب رکھے آئی فون کی جانب
نگاہ اٹھتی ہے
برقونی ڈاک دیکھتا ہوں
طرح طرح کے پیامات فیس بک پر ہیں
ہر اک پیام ہے اپنی طرف سے داد طلب
ہر اک مصور و صناع شعر و نثر نگار
ہے منتظر
نگہ ''دوست'' کی عنایت کا
پسند ہو کہ نہیں ہو وہ ''دوست'' ہے اپنا

لگائے جایئے اپنی ''پسند'' کی مہریں
بس ایک حلقہ احباب ہے جہانِ بسیط
ہو جیسے اب یہی شام و سحر نفس پہ محیط
یہاں
تو آنکھ ٹھہرتی ہے

ایک پَل کے لیے
غریب شعر کہیں گم ہے، بے ٹھکانا سا
جمالِ حرف
پسِ حرف ہے نہاں
جو کبھی
کسی بھی آنکھ کی میزان میں نہیں تُلتا
یہاں تو بھیڑ ہے بس بے قرار جلووں کی
ورق دریچہ یہاں ذہن کا نہیں کھلتا

اجالا پھیل گیا
خیر سے گھر آنگن تک
تو کیوں نہ آج کے اخبار پر نظر ڈالوں

دھچکے

بیٹوں سے
ماں باپ کو اپنے رشتے کی مضبوطی کا
احساس توانا رکھتا ہے
لیکن
بیٹے اپنے روز و شب کی سرشاری میں
اپنی غرض کے اسیر
انہیں دھچکے دے دے کر
اُن کی بڑھتی کمزوری میں اور اضافہ کرتے ہیں
اُن کی چپ میں
درد کی لرزش دیکھ کے
دانستہ کچھ جھوٹے، خیراتی لفظوں سے
پاس پڑی ردی کی ٹوکری بھرتے ہیں
اُن کے چھوٹے موٹے کام بھی
کل پر ٹال کے
لَوٹ کے آنے سے ڈرتے ہیں
کل جو کبھی آتا ہی نہیں

لبنیٰ صفدر/لاہور

مشعل اُٹھا کے چلو

ہر خوف کی الگ شکل ہوتی ہے
ہر مشکل دوسری سے زیادہ بھیانک ہوتی ہے
ہر تمنا کی الگ صورت ہوتی ہے
اور ہر صورت حسین ہوتی ہے
کچھ آنکھیں مسکرانے کے جتن میں
اپنی ٹوٹی ہوئی پلکوں سے رونے لگتی ہیں
آنکھوں کا ہر جذبے سے گہرا تعلق ہوتا ہے
صرف ہونٹ ہی نہیں مسکراتے
آنکھیں اس ہنر سے زیادہ آشنا ہیں
دو جھروکے دو کائناتوں کے دروازے
ہر مسافر کے لیے کھلے رہتے ہیں
مشعل جلانا ہر ہاتھ کے مقدر میں نہیں ہوتا
کسی نے ہمارے راستے میں
روشنی کی لکیر کھینچ دی ہے
تصویر بنانے کا ہنر
لکیر کھینچنے کے بعد آتا ہے

ہجرت کی طرف

خواہشوں میں دراڑیں پڑنے لگی ہیں
درد کو زخموں میں مدفون کرنا پڑے گا
ناخن کی نوک پر پڑی ہوئی خراش
اُنگلیوں کے پوروں پر لکھی
جرم کی ایک داستان ہے
ہمارے آنچلوں سے گرے لال پھول
ہمیں بدنام کرنے کی سازش میں
استعمال ہو رہے ہیں
ستارے سہولت کار ہیں
سمندروں کے سفر پر جانے والوں کے لیے
یہ سہولت ہمیں ابھی تک درکار نہیں
درکار اور میسر دو الگ الفاظ ہیں
دو الگ معنی ہیں
کوئی بھی راستہ
دوسرے راستے کا نعم البدل نہیں ہوتا
آنکھ سے گرے ہوئے آنسو
اکثر بے مول ہو جاتے ہیں
سانس آہستہ لینے سے بھی
خاموشی کا طلسم ٹوٹ سکتا ہے
بعض اوقات آنکھ جھپک لینے سے
دنیا پتھر کی ہو جاتی ہے
ہمارا چلتے رہنا
ہمارے زندہ رہنے کا سبب ہے

نئے خداؤں کی تلاش

سمندر کے اس پار ایک جزیرے پر
سنا ہے، آج کل اک نئے خدا کا بسیرا ہے
سورج کی روشنی
ساحلوں پر ماند پڑ رہی ہے
آسمان پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک
ایک قوسِ قزح کے بنفشی سنہرے کنارے
ماند پڑنے لگے ہیں
سفید اور سیاہ رنگ میں سیاہ جیت گیا ہے
سیاہی کے سپاہی ہر طرف پہرا دے رہے ہیں
مایوسی کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا
لیکن چہرے پر اس کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے
ہماری بوسیدہ کشتیاں
اب ہمارے خوابوں کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہیں
ہماری آنکھوں کی پتلیوں پر
سمندر کی ریت جم چکی ہے
ستارے کے اشارے پر ایک ناؤ ڈوب رہی ہے
زندگی سیاست کا کھیل کھیلنے میں مشغول ہے
چاند نے راتوں رات کہیں ہجرت کر لی ہے
سوکھے لبوں پر
محبت کے پھول نہیں کھلا کرتے
ہماری کمانوں کے سب تیر ختم ہو چکے ہیں
نئے سورج کے ساتھ ہمیں
نئی سرزمینوں کی طرف ہجرت کر کے
کچھ نئے خداؤں کو تلاشنا ہوگا

اک اُدھورا گیت

زندگی!
ایک مکمل محبت کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتی
دو چھلکتے جام اور
پوروں پہ چمکتی کہکشاں
سپنے کو تصویر کرنے کے لیے کافی ہیں
راستے خود بخود
اپنے مسافر کے ساتھ چلتے ہیں
پھول اپنے ہونے کی نشانی
اُس کے گالوں پہ چھوڑ آئے ہیں
راز کے گھنے جنگلوں میں بھٹکتی ہوئی
کئی ابابیلیں خشک پتوں پر
رقص کے فن سے آشنا ہو رہی ہیں
اُڑتے پنچھیوں نے کچھ سُر کچھ گیت
اپنے پروں سے باندھ رکھے ہیں
تم نے ابھی پوری طرح آنکھیں نہیں کھولیں
پچھلے کواڑ سے کوئی خود سر بیل
دروازے کے راستے سے
صحن کے اندر تک پھیل چکی ہے
میں نے اُس راز کو اپنی مٹھی میں چھپا رکھا ہے
جس کی تلاش میں تم انجان جزیروں پر
ہر پھول اور ہر پتے کی تلاشی لے رہے ہو
تمہیں میرے دل کے اندر جھانکنا چاہیے تھا

علامات

محمد یوسف وسیر/گوجرانوالہ

سعید آج کل بہت پریشان تھا۔ کاروبار مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ اس سال بارشیں کم ہوئیں اور گندم کی فصل نہ ہونے کے برابر تھی۔ گھر میں ناچاقی الگ۔ اور شاید ناچاقی کی وجہ بھی بھوک ہی تھی جس کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ذہن کئی ماہ سے تناؤ کا شکار تھا۔ سوتے جاگتے، جاگتے سوتے، پریشانی ہی پریشانی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں اس کے پاس ایک ہی ٹھکانا تھا، سائیں فاروقی کی ڈھیری۔

سائیں فاروقی اس کا بچپن کا دوست تھا۔ اچھا بھلا، صحت مند، عقل منداور سعادت مند آدمی تھا۔ اچانک ہی اس کی زندگی کی ڈگر بدل گئی۔ اپنی وراثتی زمین میں ایک ٹیلے پر، جسے مقامی زبان میں ڈھیری کہتے ہیں، ایک کٹیا بنالی اور گھر والوں سے تمام تعلقات منقطع کر کے اس کٹیا میں آن بسا۔ باتوں کا دل دادہ تو بچپن ہی سے تھا، لیکن جب سے بھنگ سے شغل کرنے لگا تب سے اس کی باتوں میں دانش مندانہ وزن اور لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اب گاؤں کے اکثر افراد اس کی باتوں اور ضیافت سے پریشانیوں کو کم کرنے کے لیے اس کے پاس جانے لگے تھے۔

سعید بھی آج کل پریشان تھا اور اپنی پریشانیوں کو کم کرنے کے لیے سائیں فاروقی کے پاس آجاتا تھا۔ دوسرے لوگوں اور سعید ایک فرق تھا۔ فرق یہ تھا کہ سعید بھنگ کو ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا اور نہ ہی کبھی سائیں نے اس کو ہاتھ لگانے دیا۔

آج بھی سعید کافی دیر سائیں کے پاس بیٹھا رہا اور حالات کے ناسازگار ہونے کا رونا روتا رہا۔ کہنے لگا۔

سوچ رہا ہوں کاروبار تبدیل کر کے دیکھ لوں۔ دوکان تو کافی ماہ سے پیچھے ہی پیچھے جا رہی ہے۔ زمین نے بھی اس دفعہ کچھ نہیں دیا۔ قرضہ چڑھ گیا ہے، گھر والی بچوں سمیت میکے جا کے بیٹھ گئی ہے۔ ایک دو کام کرنے کی کوشش کی لیکن شروع میں ہی تارے نظر آ گئے اور وہ بھی گردش میں۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

تم ابھی صبر کرو کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ سائیں نے تحمل سے کہا۔

یہ گردش ایام کی علامتیں ہیں۔ جب دن گردش میں آتے ہیں تو زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سارے معاملات ہی الٹے چل پڑتے ہیں۔ پھر جب دن پھرتے ہیں تو تمام کام سدھر جاتے ہیں۔ حالات لہروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ یہ اتار چڑھاؤ چھوٹا بھی ہو سکتا ہے بڑا بھی۔ ان لہروں کا تعدد کم بھی ہوتا ہے اور زیادہ بھی۔ اس کی طول موج چند دن پر محیط بھی ہو سکتی ہے اور صدیوں پر بھی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں کئی دفعہ اچھے اور کئی دفعہ برے حالات کا سامنا کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے حالات کی تبدیلی کم طول موج رکھتی ہے۔ کسی شخص کی پوری زندگی خوش حالی میں گذرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے حالات کی طول موج صدیوں تک محیط ہے۔ اگر وہ شخص صدیوں زندہ رہتا تو زوال ضرور دیکھتا۔ اسی طرح جو شخص حالات کی کے نشیب کے دوران پیدا ہوا ہو اور اس کی گردش کی موج صدیوں تک محیط ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نشیب ہی میں دنیا سے چلا جائے گا کیوں کہ اس کی زندگی چار سو سال تو ہو نہیں سکتی۔

تمہارے حالات کی طول موج کیا پتا کتنی ہو۔ ہو سکتا ہے چند دنوں یا چند ماہ تک ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ صدیوں تک ہو اور آخری سانس تک اچھے حالات ہی کے منتظر رہو۔ بس تم صبر کرو اور اچھے حالات کا انتظار کرو۔

لیکن مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ گردش سے نکل گئے ہیں میرے دن؟

سعید نے بجھے سے مایوسانہ لہجے میں پوچھا۔

سائیں کہنے لگا۔

تمھیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ جب حالات بدل جائیں گے تو تمہارا ہر قدم سیدھا پڑے گا۔

اچھا تم ایک کہانی سنو، یہ کہانی تمھارے حالات سے مطابقت رکھتی ہے اور تمھیں پتا چلے گا کہ علامتیں کیا ہوتی ہیں۔

جی بولو میں سن رہا ہوں۔ سعید نے بے دلی سے کہا۔

سائیں کہنے لگا۔

ایک آدمی تھا تمھاری طرح گردش حالات کا شکار۔ کافی پرانی بات ہے۔ اس شخص کا بچپن کا دوست امیر شہر تھا۔ وہ شخص اس دوست کے پاس گیا اور نامساعد حالات کا ذکر کیا۔ اس کے دوست نے پتا ہے کیا کیا؟

کیا کیا؟ سعید بے قدرے تجسس ہو کر پوچھا۔

اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ اس دوست کو قید کر دیا جائے۔ چند ماہ بعد اس نے اس کو قید سے نکالا، کافی مقدار میں دولت دی اور کہا یہ لو اور جا کر کوئی کاروبار کرو اور اپنی روزی کماؤ۔ وہ شخص غصے اور نفرت

میں جلتا ہوا رقم لے کر چلا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کا کاروبار چمک اٹھا اور وہ خوش حال ہو گیا۔

معاشی مشکلات سے نکلا تو غصہ بھی قدرے کم ہوا، جتنی رقم اس امیر دوست سے لی تھی تھیلے میں ڈالی اور اس کے پاس جا پہنچا۔ اس کے دوست نے نہایت گرم جوشی اور محبت سے اس کا استقبال کیا۔ اس نے روکھے اور جلتے ہوئے دل کے چہرے پر روٹھا پن ظاہر کیا تو امیر شہر نے خود ہی اس واقعے کی توجیہ کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت تمہارے حالات گردش میں تھے۔ میں نے تمھیں بند کر دیا تا کہ تم کوئی کام نہ کرو، تمہارے گھر کفاف بھیجتا رہا اور تمہارے نام پر کچھ چیزیں خرید کر کسی کے ذریعے کاروبار کراتا جو کافی دنوں تک نقصان میں جاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ تمہارے نام کا کاروبار نفع دینے لگا۔ یہ رقم تمہارے کاروبار ہی کا نفع تھی جو میں نے تمہیں دی تھی۔

اسی طرح زندگی کے تمام افعال و اعمال میں جو ہمیں اتار یا چڑھائی کی خبر دیتی ہیں۔

سعید یہ کہانی اور گردش ایام کی لہر کا فلسفہ سن کر قدرے مطمئن ہو گیا اور گھر واپس آ گیا۔

اب سعید نے علامتوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اس نے قریبی قصبے سے کوڑیاں اور پانسے خرید لیے۔ کوڑیوں اور پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے لگا۔ وہ دن رات میں پانچ دس مرتبہ کوڑیاں پھینک کر گنتی کرتا۔ اس نے طے کیا کہ ایک وقت میں دس بار کوڑیاں پھینکا کرے گا۔ اگر پانچ سے زائد مرتبہ گنتی تسلی بخش آئے تو یہ بہتر حالات کی علامت ہوگی۔ اسی طرح پانسوں کی گنتی بھی کرتا رہتا۔ اس نے محسوس کیا کہ واقعی ستارے گردش میں ہیں اور سائیں کی بات بھی ٹھیک ہی لگ رہی تھی کہ گردش کے اثرات چاروں طرف سے حملہ کرتے ہیں کیوں کہ کوڑیوں اور پانسوں کا نتیجہ مسلسل ہی مایوس کن تھا۔

ان کا گاؤں ضلعی مرکز سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں تک پکی سڑک تھی۔ وہاں سے گاؤں تک لوگ پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ سطح مرتفع کا علاقہ تھا، زمین اونچی نیچی تھی اور بارش کے موسم میں راستہ پھسلواں ہو جاتا تھا۔ گاؤں کی آبادی زیادہ نہیں تھی، تمام لوگ ایک دوسرے کو نسلوں سے جانتے تھے اور ایک دوسرے سے اچھے مراسم رکھتے تھے۔ کبھی کبھار چھوٹے موٹے جھگڑے بھی ہو جاتے لیکن معاملہ تھانے کچہری تک نہ پہنچتا۔ گاؤں کے زیادہ تر مرد فوج میں ملازم تھے اور ملازمت ہی اس گاؤں بڑا ذریعہ معاش تھا۔ جو مرد حضرات اپنی ملازمت سے سبک دوش ہو جاتے وہ سارا سارا دن ڈیروں پر یا قصبے کے اڈے پر بیٹھ کر گپیں ہانکتے اور چائے پیتے ہوئے فوج کی زندگی کے واقعات دہراتے رہتے۔

گاؤں کے لوگ فارغ وقت گزارنے کے لیے مختلف قسم کی کھیلوں کا اہتمام کرتے رہتے جیسا کہ پتھر اٹھانے کا مقابلہ، دوڑ، مرغوں بٹیروں اور کتوں کی لڑائی وغیرہ۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے والوں کی نسبت دیکھنے والے زیادہ لطف اندوز ہوا کرتے تھے اور زیادہ پرجوش ہو کر مقابلوں کا اہتمام کرتے کیوں کہ انہوں نے شرطیں باندھنی ہوتی تھیں۔ شرطوں کے لیے رقم لگانا ضروری نہیں تھا بس جیت ہار کے لیے بھی شرطیں باندھی جاتی تھیں۔

سعید کو بھی شرطوں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور آج کل مسلسل ہار رہا تھا۔ اور مسلسل ہار سے مایوس ہو کر اسے حصہ لینا ہی کم کر دیا تھا بلکہ اکثر اوقات وہ مقابلہ دیکھنے بھی نہ جاتا۔ اس نے مسلسل ہار کو نظر بد سے محمول کر کے کچھ ٹونے ٹوٹکے بھی کروائے تھے اور منتیں بھی مانی تھیں لیکن فائدہ نہیں نظر آ رہا تھا، حالات بگڑتے ہی جا رہے تھے۔

ایک دن سعید کو گھر کی کیاری میں لگے گلاب کے پودے پر کونپل نظر آئی۔ اسی دن شبیر حسین نے، جو حال ہی میں ملازمت سے سبک دوش ہو کر آیا تھا، وعدہ کیا کہ چند دن بعد اسے دوکان میں سودا ڈالنے کے لیے رقم دے گا اور اس رقم کی واپسی چاہے قسطوں میں کر لینا۔

ایک ہی دن میں دو خوش خبریاں، لگتا تھا کہ مقدر کی لکیر کا رخ اوپر کی طرف ہونے لگا ہے۔ اس دن کے بعد سعید نے تمام علامتوں کو شدت سے آزمانا شروع کر دیا۔ کوڑیوں اور پانسوں کے نتائج بہتر ہونے لگے۔ اب اس نے مقابلوں میں جانا اور حصہ لینا شروع کر دیا اور اکثر جیت بھی جاتا۔

پانسوں کے چاروں چھکے اسے اس دن پڑے جس دن سہ پہر کے وقت شبیر حسین نے اسے رقم پکڑائی۔ اسی شام کو وہ فاروقی کے ڈیرے پر بیٹھا سودے کی فہرست بنا رہا تھا جو اس نے اگلے دن شہر سے لانا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ سحری وقت نکلے گا دوپہر تک واپس آئے گا اور شام تک سودا دوکان میں سج جائے گا۔

دوپہر تو دور تھی سعید سورج طلوع ہونے کے فوراً بعد گاؤں واپس آ گیا بلکہ اسے لایا گیا تھا۔ قصبے کی طرف جاتے ہوئے پھسلواں راستے پر پھسل کر دور تک لڑھک جانے کی وجہ سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اس نے وہیں پر جان دے دی تھی۔

استقامت

آسناتھ کنول/لاہور

جنوری اپنے جوبن پر تھا۔ باہر کُہرے کی چادر نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سردی کی شدت اس کی بوڑھی ہوتی ہوئی ہڈیوں میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ وہ کافی گرم کپڑے پہنے اور گرم چادر کو اردگرد کس کر لپیٹے ہوئے آتش دان کے سامنے کشن پر براجمان سردی کی اس شدت کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے داہنے ہاتھ سے اپنی خشخشی داڑھی کو کھجایا۔ کافی دنوں کی کسلمندی اور شدید سردی کے اس منظر نے اُسے اس کام سے باز رکھا تھا۔ آنکھوں میں تفکر اس کی نیند حرام کرتا رہا۔ چوڑے ماتھے پر گہری ہوتی ہوئی لکیروں میں اک فکر کی لکیر نمایاں ہوئی۔ آنکھیں سائے کے تعاقب میں چہرے کو تلاش کرتی ہوئی دیواروں سے پھسل کر آتش دان پر آ رُکتیں۔ ایک نامعلوم سی اُداسی سارے کمرے میں چکراتی پھرتی تھی۔ اِک آہ اُس کے لبوں سے برآمد ہوئی۔ اگر یہ شدید ٹھنڈ نہ ہوتی تو یہ سورج اتنی بے اعتنائی نہ دکھاتا۔ وہ گھر کے خوبصورت گارڈن میں سنگی بینچ پر بیٹھا، اخبار پڑھتا، کافی پیتا اور اور دُھوپ کی نرم کرنوں سے لطف اندوز ہوتا، اُس نے سوچا کتنا پُرلطف ہوتا سب کچھ۔ اُس نے خود کو دُھوپ سے (وٹامن ڈی) کشید کرتے پایا۔ یکدم ہی اِک مایوسی کی لہر نے اُس کے تصورات کو مسخ کر دیا۔ کچھ دیر پہلے اُس نے کھڑکی سے جھانکا تھا۔ ہر طرف دُھند نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تاحدِ نظر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

آج اتنی سردی ہے۔ خانساماں۔ اپنے قریبی گاؤں سے کیسے آ پائے گا؟ وہ آتا تو کچھ کھانے کو ملتا۔ وہ تو صرف بمشکل آتش دان ہی روشن کر سکا تھا۔ اُس نے اِس سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے کچھ خشک پھل اور میوے قریب رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ختم ہونے والے تھے۔ چائے کافی کبھی اُس نے بنائی نہیں تھی۔ اُسے کبھی اِس تجربے سے گذرنا نہیں پڑا تھا۔ سب کچھ بنا بنایا سامنے حاضر ہو جاتا تھا۔ جب تک بیوی زندہ رہی، اُسے کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ بیوی نے گھر بار پوری دانشمندی سے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ہر گھریلو فکر سے آزاد صرف اپنی نوکری میں مگن رہتا۔ بیوی کی جدائی اور مستقل تنہائی نے اُسے اُجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اِس اذیت سے دوچار خودترسی میں مبتلا ہو چکا تھا۔

کاش تم کچھ عرصہ اور رُک جاتیں تو میری زندگی کچھ اور سہل ہو جاتی۔ کتنی دیر وہ اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتا رہا۔ دل کے گداز کے باعث آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ ایک نامعلوم وحشت گھیرنے لگی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ کیسے ایک بھرا پُرا گھر خالی ہو گیا۔ بچے جوان ہو کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھے۔ اور یہ گھر جو اُس نے بڑی محبت اور خوشی سے بیوی کے ساتھ مل کر بنایا تھا، خالی اور اُجاڑ پڑا اپنے چہکتے ہنستے مکینوں کو ترستا تھا۔

آصف رضا خان کا یہاں کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ کبھی کبھار ہمسائی مسز جمشید آ ٹپکتی۔ آصف رضا کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے وہ کتنی بار اُسے شادی کا کہہ چکی تھی۔ اپنی بیوہ بہن کے ساتھ جو کراچی میں ایک سکول چلاتی تھی، اور رضا خان اُتنی ہی مرتبہ انکار کر چکے تھے۔ اب گھر کی دیکھ بھال، صفائی، کھانا پکانا سب خانساماں کے ذمہ تھا۔ ایک عدد چوکیدار تھا، جو بہت کم اندر آتا۔ وہ صرف خانساماں ہی سے کام رکھتا اور خانساماں بلاشرکت غیرے ہر کام پر معمور تھا۔ بلکہ مالک تھا۔ آصف رضا خان پچھلے دو دن سے اپنی سوچوں میں گرفتار تھا۔ اور خانساماں ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اُسے شدت سے بھوک ستانے لگی تھی۔ کب تک ٹھنڈا پانی پی کر گزارا کرتا۔ خانساماں آتا تو کچھ پکا کر دیتا۔ کوئی تازہ سوپ، یخنی، کوئی شاندار ڈش۔ وہ سوچنے لگا۔ زندگی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ کہاں وہ کروفر والا آفیسر۔ کہاں اُس کے آگے پیچھے ملازموں کی قطاریں اور کہاں یہ بوڑھا ہوتا وجود جو ناتوانی کی طرف گامزن تھا۔ نہایت سلیقہ شعار اور ہنرمند بیوی نے سب کچھ بھلا رکھا تھا۔ اور ریٹائرڈ لائف نے اُسے زندگی کی دوڑ سے باہر کرنے کی سعی کر رکھی تھی۔ اور اب کی بار سردی کی اس شدت نے اُس کے قویٰ مضمحل کر دیے تھے۔ آج تیسرا دن تھا۔ اُس نے بازوؤں کا پورا زور لگا کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر وجود کشن پر ہی رکھا رہ گیا۔ بھوک کی شدت نے نقاہت بڑھا دی تھی۔ وہ کچھ دیر ہانپتا رہا۔ میں کبھی اتنا کمزور تو نہیں تھا۔ خانساماں کی غیر حاضری نے تو جیسے زندگی کرنے کا شوق ہی ختم کر ڈالا تھا۔ کیا آج تک میں صرف دوسروں کے آسرے ہی جیتا رہا ہوں۔

اُس نے سوچا مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ باہر چاہے برف ہی کیوں نہ گر رہی ہو۔ مجھے اپنے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ محتاجی کب تک! میرے پاس پیسے ہیں تو میں محتاج کیوں؟ اُس نے خود سے سوال کیا اور پھر ہمت دکھائی۔ اُس بھوک کی وجہ سے جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اگر یہیں پڑا رہا تو یقیناً مر جاؤں گا۔ اور یہیں مر جانا کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اُس نے بارِ دیگر ہمت جمع کی۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے پانی پیا۔ ٹانگوں میں کچھ جان آئی تو کچن کی جانب چل دیا۔ کھڑکی سے جھانکا تو کُہرا بدستور جما کھڑا تھا۔ فریج کھولی تو حیران رہ گیا۔ اُس میں کھانے پینے کی کافی چیزیں موجود تھیں۔ کیسی حماقت ہے۔ خانساماں کے

انتظار میں پچھلے دو تین دن سے اُس نے کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی عقل کو کوسنے لگا۔ اُس نے کچھ پکی ہوئی سبزیاں اور بریڈ نکالی۔ جوس نکالا۔ چیزوں کو اوون میں گرم کیا۔ اور کچن میں کھڑے کھڑے ہی کھانے لگا۔ جیسے ہی جسم میں خوراک گئی توانائی بحال ہونے لگی۔ چکر آنے بند ہوئے۔ تو چائے کافی بنانے کا طریقہ نیٹ پر دیکھ کر کافی کا ایک بڑا مگ تیار کیا۔ اور آتش دان کے سامنے بیٹھ کر پینے لگا۔ یوں جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ پی رہا ہو۔ کم از کم اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تو وہ پہلی مرتبہ ہی پی رہا تھا۔ جیسے امرت رس پی رہا تھا۔ بھوک کتنی بڑی حقیقت ہے۔ اُس نے سوچا۔ سردی کی شدت میں بھی کمی محسوس ہوئی۔ موسم اتنا بھی ٹھنڈا نہیں جتنا میں نے خود پر سوار کر رکھا ہے۔ شاید بھوک اور کمزوری کی وجہ سے لگتا ہوگا۔ اس کے اردگرد کتنی دُنیا بھوکی سوتی ہوگی۔ اُس نے افسری کے زعم میں سوچا ہی نہیں تھا۔ مگر پچھلے دو تین دنوں نے اُسے زندگی کا یہ سبق عملی طور پر یاد کروا دیا تھا۔ میں کتنے لوگوں کی مدد کر سکتا تھا۔ مگر نہیں کی۔ یہ کتنی قابل افسوس بات ہے۔ کافی پینے کے بعد اُس نے باہر جھانکا۔ کچھ دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کُہرا کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ بار بار فون کرنے کے باوجود خانساماں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

چلو ذرا مارکیٹ تک جاتا ہوں۔ کچھ کھانے کو لے آؤں۔ اور ذرا گھوموں پھروں۔ زندگی کو محسوس کروں۔ اب وہ نئے سرے سے کچھ سوچ رہا تھا۔ خانساماں کو کیا ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں تھا۔ ضرور کوئی مسئلہ ہوگا۔ چلو فون کرتا ہوں۔ کوئی تو اُٹھائے گا وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ میرا خیال ہے مارکیٹ تک جانا چاہیے تاکہ شام کے کھانے کے لیے کچھ تازہ لے آؤں۔ ذرا سستی بھی دُور ہوگی۔ وہ گھر سے باہر نکلا۔ چاکیدار دروازے پر موجود تھا۔

تم بہت بیوقوف آدمی ہو۔ دل چاہتا ہے کھڑے کھڑے تمہیں نوکری سے نکال دوں۔ کتنے بے حس ہو۔ رضا خان اُسے ڈانٹنے لگا۔ وہ ہونقوں کی طرح اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے خانساماں غائب ہے۔ جانتے ہو ناں۔ جی صاحب! میں بھی آج ہی آیا ہوں۔ میری والدہ بیمار تھیں اور میں خانساماں کو بتا کر گیا تھا۔ تو آج تم نے خانساماں کو بتایا کہ تم آ گئے ہو۔ مجھ سے پوچھنا اور بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا خانساماں تمہیں تنخواہ دیتا ہے۔ رضا صاحب کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ غلطی ہو گئی صاحب، معاف کر دیں۔ بچوں والا ہوں۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔ رضا صاحب خاموش ہو گئے۔ اپنی کمزوری کو ایک گارڈ پر ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ خیال رکھنا۔ کوئی ملنے آئے تو بتا دینا۔ جی صاحب۔ وہ شرمندہ سا نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس بات پر تو وہ بھی حیران تھا کہ خانساماں احمد علی اب کیا نہیں آئے گا۔ وہ کافی دیر سوچتا رہا۔

آصف رضا خان مارکیٹ پہنچے۔ ماحول کافی خوشگوار لگا۔ یا شاید پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا، دونوں ہاتھ کوٹ میں دبائے وہ ایک پیزا ہٹ کے سامنے پہنچے۔ چلو ایک پیزا پیک کروا لیتا ہوں۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی کوئی شاپنگ کی ہی نہیں تھی۔ اچھا لگا میں خود کو کتنا بے بس سمجھ رہا تھا۔ کاش! میں نے پہلے ہی ان معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ وہ دُکان پر پہنچا۔ ایک برقعہ پوش عورت ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ اُلجھ رہی تھی۔ اُس کی بے بسی اُس کی باتوں سے عیاں تھی۔ وہ بچے کو یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ پیزا اُس کی قوت خرید سے باہر ہے۔ مگر بچہ ماں کی مجبوری نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ ضد کرتا گیا کہ مجھے یہ چاہیے۔ رضا خان کچھ دیر یہ صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ تو پتہ چل گیا تھا۔ کہ بچہ پیزا مانگ رہا تھا۔ اور ماں یہاں تک تو آ گئی ہے مگر پیزا خریدنے کی ہمت اُس میں نہیں ہے۔ وہ پیزا ہٹ کے اندر گئے، دو لارج پیزا آرڈر کیے۔ کچھ دیر بعد باہر نکلے تو خاتون بچے کو گھسیٹتے ہوئے واپس جا رہی تھی۔

بچہ پلٹ پلٹ کر دُکان کو دیکھتا اور اپنا مطالبہ دہراتا رہا۔ سُنیے۔ رضا خان نے ہمت کر کے خاتون کو آواز دی۔ وہ یکدم رُکی۔ جیسے کسی اُمید پر قدم رُک گئے ہوں۔ رضا خان اُس کے قریب پہنچے۔ یہ لیجیے۔ نہیں نہیں یہ تو ایسے ہی ضد کیے جاتا ہے۔ میں اسے کل لے دوں گی۔ عورت کی آواز میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔ وہ بے چینی سے ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔ یہ میں نے بچے کے لیے ہی لیا ہے۔ گھبرائیں نہیں۔ رضا خان نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس عوامی عمل سے اُسے بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ ذرا سی نیکی بھی کتنا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اُس نے محسوس کیا۔ شکریہ صاحب۔ آپ نیک انسان معلوم پڑتے ہیں۔ بچے نے جلدی سے ڈبہ تھام لیا۔ ایک اور بات اگر آپ کو کبھی کوئی ضرورت ہو تو یہ قریب ہی گرے کلر کا گیٹ ہے۔ آصف رضا خان میرا نام ہے۔ آپ بے فکر ہو کر آ سکتے ہیں۔ آئیے آپ کو گیٹ دکھا دوں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کی جانب چل پڑا۔ بچہ بھی ماں کا ہاتھ پکڑے خوشی خوشی چل رہا تھا۔

عورت کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ گھر قریب ہی تھا۔ گھر قریب ہی تھا۔ وہ گیٹ پر پہنچے۔ ایک بات اور۔ اگر آپ کو کام کی ضرورت ہو، کھانا وغیرہ پکانا جانتی ہوں تو مجھے بھی گھر کے لیے ایک میڈ کی ضرورت ہے۔ آپ کو ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔ رضا خان نے کچھ پیسے نکال کر بچے کو دیے۔ بیٹا یہ رکھ لو۔ کچھ لے لینا۔ عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ شکریہ صاحب۔ میں کل آپ کو جواب دوں گی۔ جی بہتر۔ عورت بچے کا ہاتھ تھامے چلی گئی۔ کافی ضرورت مند لگتی تھی۔ شیر

خان۔ جی صاحب۔ یہ خاتون اگر آئے تو اس کا نام پتہ پوچھ کر مجھے بتا دینا۔ اس کے گھر بار کا پتہ کر لینا۔ کھانا پکانے اور گھر کے کاموں کے لئے رکھ لیں گے۔ جی صاحب، بہت بہتر۔

دامن کوہ سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں نے سارے اسلام آباد کو سردی کی شال میں لپیٹ لیا تھا۔ رضا خان پیزا لیے آتش دان کے سامنے آبراجے۔ وہ پچھلے دو دن کے واقعات کو یاد کر رہے تھے۔ جب کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ رضا خان زندہ ہے یا مردہ۔ اللہ کا شکر ہے۔ میں نے بروقت کوشش کر لی۔ وہ خود کو کافی توانا اور خوش محسوس کر رہا تھا۔ سامنے دیوار گیر ٹی وی کو آن کیا اور حالات حاضرہ سے آگاہی حاصل کرنے لگے۔

صاحب اندر آجاؤں۔ ہاں آجاؤ۔ چوکیدار شیر خان اندر آیا۔ صاحب وہ لڑکی آئی ہے۔ جس سے آپ نے نوکری کی بات کی تھی۔ چلو اچھا ہے۔ بھیجو اُسے۔ رضا خان کُشن سے اُٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ حجاب میں ملبوس خاتون بچے کا ہاتھ تھامے اندر آئی۔ سلام صاحب۔

تو تم نے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جی صاحب! وہ آہستہ سے بدبدائی۔ تمہارا نام؟ ناصرہ امجد۔ کہاں رہتی ہو؟ صاحب وہ مشرقی کنارے کی کچی بستی میں کرائے کا ایک کمرہ ہے۔ سلائی کا کام کرتی ہوں۔ اپنے اور بچے کے لئے ایک وقت کی روٹی مہیا ہو جاتی ہے۔ شوہر ناحق ہی قتل ہو گیا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ بس ایک بیٹا ہی سہارا ہے۔ اچھا ۔ گڈ۔ رضا خان نے ہنکارہ بھرا۔ تو ٹھیک ہے۔ آپ آج ہی کام پر آجاؤ۔ دراصل پچھلے دو سال سے میرے خانساماں نے ہی سارا کام سنبھالا ہوا تھا۔ کافی دنوں سے وہ آنہیں رہا۔ اس کا فون بھی بند ہے۔ میرے لیے یہ مسئلہ بن گیا ہے۔ صاحب اس کے آنے کے بعد! خاتون نے تشویش سے پوچھا۔ نہیں نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو کام پر رکھ لیا ہے۔ بے فکر رہو۔ ہاں بس ایک چیز کا خیال رکھیے۔ نئی ملازمہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بدستور حجاب میں تھی۔ بس ذرا صفائی ستھرائی کا خیال رکھیے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ اب کہ وہ ذرا ریلیکس ہوئی۔ وہ واپس مڑنے لگی تھی۔ ہاں رُکو۔ وہ انہی قدموں پر واپس پلٹی۔ یہ کچھ پیسے رکھو۔ اپنے اور اپنے بچے کے لیے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لے لینا۔ اندر باہر آنے جانے کا مسئلہ ہو تو شیر خان ہے اسے کہہ دینا۔ شکریہ صاحب۔ شیر خان۔ اندر آؤ۔

جی صاحب۔ اس خاتون کو ساری جگہ دکھا دو۔ کام سمجھا دو۔ سرونٹ کوارٹر بھی دکھاؤ۔ اور کوئی کام ہے تو وہ بھی کرنا ہے۔ چونکہ وہ بچے والی عورت ہے۔ بار بار اندر باہر آنا جانا مشکل ہوگا اُس کے لیے۔ جی صاحب ٹھیک ہو گیا۔ ہاں اُسے کہو کچن میں دیکھے جو چیز کم ہو، اُسے لا دینا۔ یہ پیسے رکھو۔ مجھے وقت پہ سب کام چاہیے۔ سر بے فکر ہو جائیں۔ اُس نے پیسے لیے اور باہر نکل گیا۔

سردی کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ پھر بھی آصف رضا خان آتش دان کے آگے بیٹھے ایک کتاب کے مطالعے میں مگن تھے۔ وہیں لیٹے لیٹے صوفے سے ٹیک لگائے ہی سو گئے۔ اچانک آنکھ کھلی تو کھڑکی سے جھانکتی شام نے مُسکرا کر دیکھا۔ وہ ابھی وقت کا اندازہ لگا رہے تھے کہ ایک جوان توانا آواز نے پُکارا۔ صاحب کافی لائی ہوں۔ آپ پینا پسند کریں گے۔ وہ کچھ دیر آواز کے زیر و بم میں کھوئے رہے۔ وہ چار گھنٹے پہلے کے واقعات کو یاد کرنے لگے۔ یہ عورت کی آواز کہاں سے آئی۔ پھر انہیں یاد آیا کہ آج ہی اُسے ملازم رکھا ہے۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ میں غالباً سو گیا تھا۔ وہ بڑبڑائے۔ جی سر۔ میں کچھ دیر پہلے دیکھنے آئی تھی۔ آپ سو رہے تھے۔ اوہو۔ کوئی کام تھا تو جگا لیتے۔ نہیں سر، آپ سے چائے کافی کا ہی پوچھنا تھا۔ شام ذرا خنک ہو جاتی ہے۔ ہاں ہاں۔ یہ تو ہے۔ تمہارے کمرے میں ہیٹر ہے۔ جی سر۔ شیر خان بھائی نے جلا دیا تھا۔ چلو اچھا ہے۔ اپنے بچے کا خیال رکھنا۔ صاحب کھانا کس وقت کھائیں گے۔ رضا خان پچھلے دو دن کے واقعات میں گم تھے۔ جب دو دن تک بھوکا رہنے پر مرنے تک نوبت آگئی تھی۔ نو بجے تک کھاتا ہوں۔ جی صاحب۔ اور ناشتہ کس وقت۔ تاکہ مجھے پتہ رہے۔ ہاں اچھی بات ہے۔ مجھے آوازیں دینا پسند نہیں۔ صبح آٹھ بجے اور دوپہر دو بجے۔ شام میں چائے یا کافی۔ بس یہی روٹین ہے۔ اب یہ گھر آپ کو ہی سنبھالنا ہے۔ سیکھ لیجیے سب کچھ۔ جی صاحب۔ اور یہ جی صاحب میرا نام نہیں۔ رضا خان مُسکرائے۔ مجھے رضا صاحب کہہ سکتی ہو۔ یس سر۔ پڑھی لکھی ہو۔ سر میٹرک تک پڑھا تھا۔ پھر غریب والدین پڑھا نہیں سکے۔ بس شادی کر دی۔ اچھا چلو خیر۔ خدا بہتر کرے گا۔

وہ واپس پلٹ گئی۔ رضا خان نے دیکھا وہ اچھے قد کاٹ کی جوان عورت تھی مگر حجاب میں رہتی۔ وقت اپنی چال چلنے لگا تھا۔ ناصرہ کچھ ہی دنوں میں سب کچھ سیکھ گئی۔ سارا گھر بڑے سلیقے سے اُس نے سنبھال لیا۔ رضا خان کی اتنی اچھی دیکھ بھال کی کہ وہ پھر سے خود کو چست اور توانا محسوس کرنے لگے۔ جم خانہ کلب جاتے۔ گالف کھیلتے۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے۔ ساری مایوسی ختم ہو گئی تھی۔

کیا بات ہے بڈی۔ نئے سرے سے جوان ہو رہے ہو۔ کوئی گیدڑ سنگھی ہاتھ لگی ہے۔ صفی الدین نے چھیڑا۔ دونوں بیچ فیلو رہ چکے تھے۔ نہیں یار ایسی بات نہیں۔ سُنا ہے کوئی میڈ رکھ لی ہے۔ غالباً اُس کی خدمت گزاریوں کا اثر ہے۔ ہاں ڈیئر۔ خانساماں بغیر بتائے چلا گیا۔ فون کوئی اُٹھاتا نہیں۔ اس کی تشویش

اپنی جگہ ہے۔ اُس کے گھر کا بھی پتہ نہیں۔ اُس کے بغیر تو بے کار ہی ہو گیا۔ یہ خاتون ضرورت مند تھی۔ پھر اُسے کام پہ رکھ لیا۔ اچھی سلیقہ شعار اور سمجھدار خاتون ہے۔ ایک بچہ ہے اُس کا۔ اچھا اچھا۔ چلو یہ تو اچھا ہو گیا۔ ویسے بھی اتنے بڑے گھر کو ایک عورت کی ضرورت تھی۔ بھابی کے جانے کے بعد تو سارا گھر ہی اُداس ہو گیا تھا۔ ٹھیک کہتے ہو صفی۔ رضا خان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

آج کل شفیق انگلینڈ سے آیا ہوا ہے اور صفدر خان بھی ہو سکتا ہے کسی دن تمہاری طرف چکر لگائیں۔ ہاں ضرور کیوں نہیں رضا نے رضا مندی ظاہر کی۔ کافی دنوں کے بادلوں کے سائے کے بعد آج پھر دُھوپ نکلی تھی، دُور مارگلہ کی پہاڑیاں چمک رہی تھیں۔ خنک ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ رضا موبائل تھامے لان کی طرف چل دیئے۔ اچانک ہی بالکل اچانک ایک جھلک ہی تھی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس، شربتی آنکھوں والی خوبصورت عورت۔ ان کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ یہ کون ہے۔ ہو سکتا ہے ناصرہ کی کوئی رشتہ دار یا دوست ہو۔ وہ متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایسی باتوں پر زیادہ غور نہیں کرتے تھے۔ ننھا رضوان ان کے قریب کھیل رہا تھا۔ اِدھر آؤ۔ رضا خان نے پیار سے بلایا۔ جی انکل۔ وہ سمجھدار اور تمیزدار بچوں کی طرح پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ آپ کا نام۔ رضوان احمد۔ اوہ! بہت خوبصورت نام ہے۔ سکول جاؤ گے۔ پڑھو گے۔ جی انکل۔ شاباش۔ رضا خان نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور کیا کھیلنا پسند ہے۔ کرکٹ، اُس نے قدرے توتلی زبان میں بتایا تو رضا مُسکرانے لگے۔ مدتوں بعد وہ کسی بچے سے مخاطب تھے۔ اپنے بچے تو کب کے اس دیس سے اُڑ چکے۔ اُن کا تو بچپن بھی اب یاد نہیں رہا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اب تو ہفتوں، مہینوں بچوں سے بات نہیں ہو پاتی۔ وہ اتنے مصروف ہیں کہ بوڑھے، اکیلے اور کمزور باپ کے لیے ایک کال کر کے حال پوچھنے کا بھی وقت نہیں ہے اُن کے پاس۔ ناصرہ نے کچن سے چائے لے کر آتے ہوئے یہ منظر دیکھا تھا۔

اُس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ رضا صاحب کتنے دُکھی ہیں۔ اُس نے سوچا۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔ اُنہوں نے دیکھا وہی کالا لباس۔ مگر اب چہرہ حجاب میں تھا۔ ناصرہ آپ کا بچہ بہت ذہین ہے۔ آپ اسے سکول میں داخل کروا دیں۔ وہ کچھ دیر خلا میں گھورتی رہی۔ آں ہاں۔ سوری۔ رضا خان بولے۔ میں شیر خان کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔ داخلہ ہو جائے گا۔ ناصرہ نے ممنون نگاہوں سے اُنہیں دیکھا۔ یہ صاحب ہیں کہ فرشتہ۔ کتنے اچھے ہیں۔ میں اپنی ساری زندگی ان کی خدمت کروں گی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

اچھا آج میرے کچھ دوست آ رہے ہیں۔ آپ دو تین ڈشیں زیادہ بنا لیجئے گا اور میٹھا بھی۔ کتنے لوگ ہونگے اندازاً۔ چار پانچ۔ ٹھیک ہے۔ بے فکر رہیں۔ وہ چائے دے کر واپس پلٹ گئی۔ وہ کتنی ہی دیر خالی نظروں سے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ بچہ ابھی تک پاس کھڑا تھا۔ اُنہوں نے پاکٹ سے کچھ ٹافیاں نکال کر بچے کو دیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ رضا کو بھی جیسے روحانی سکون میسر آیا۔ ناصرہ کے دل میں رضا خان کے لیے ہمدردی بڑھ گئی۔ اُس نے صاحب کے بارے میں شیر خان سے کافی کچھ سُن رکھا تھا۔ مگر اب اُسے یقین آ رہا تھا کہ اُس نے جو کہا وہ سچ تھا۔

آج شام گھر میں کافی گہما گہمی تھی۔ رضا خان کے چار عدد پرانے دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سب اپنے پرانے قصے کہانیوں میں مگن تھے۔ اچانک ہی ایک جوان سُریلی آواز کان میں پڑی۔ سر چائے لگ گئی ہے۔ سب کان کھڑے ہوئے۔ چونک کر آواز کی جانب دیکھا۔ مگر آواز والی وہاں نہیں تھی۔ بڑے چُھپے رستم نکلے۔ اویس خان نے چھیڑا۔ اوہ نہیں یار۔ یہ میری نئی میڈ ہے۔ شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ بڑے بکھیڑے ہیں۔ چلو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ چائے کے ساتھ بہت سے لوازمات دیکھ کر سب حیران ہوئے۔ رضا تمہارے گھر میں اس سے پہلے اتنی اچھی چائے نہیں پی۔ صفدر نے ٹہوکا دیا۔ اب مل گئی ہے ناں۔ چُپ کر کے پیو۔ بڑے کھوسٹ سارے لڑکے بنے ہوئے ہیں۔ کیا کہا۔ لڑکے ہی ہیں۔ دل جوان ہونا چاہیے بس۔ صفی نے بات بڑھائی۔ یونہی گپ شپ میں سبھی صحن سے باہر آ گئے۔ گپ شپ میں اچانک ننھا رضوان کہیں سے برآمد ہوا۔ اُسے ہاتھ پہ چوٹ لگی ہوئی تھی۔ رضوان بیٹا اِدھر آؤ۔ یہ کیا ہوا۔ انکل گر گیا تھا۔ دکھاؤ مجھے۔ اُنہوں نے ہاتھ دیکھا۔ پانی سے صاف کیا۔ اچھا جاؤ۔ ماما سے کہو۔ کچن کی ایک الماری میں دوائی پڑی ہے۔ وہ آپ کو لگا کر دے۔ اور یہ بھی لو۔ اُنہوں نے دو تین ٹافیاں نکال کر اُسے تھما دیں۔ بڑا بہادر بچہ ہے۔ رویا نہیں۔

یہ اس میڈ کا بچہ ہے۔ بہت اچھا بچہ ہے۔ سبھی دیکھ رہے تھے کہ رضا خان کتنا خوش ہے ان لوگوں کی وجہ سے۔ باتوں باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ سر کھانا لگ گیا ہے۔ آ جائیے۔ پھر وہی سُریلی آواز سُنائی دی۔ یار اپنی میڈ سے تو ملوا دو۔ تم نے تو اُسے خفیہ رکھا ہوا ہے۔ یار وہ عام عورتوں جیسی نہیں ہے۔ پردہ دار عورت ہے۔ میرا گھر اُس نے اچھے سے سنبھال رکھا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔ ویسے ہم سب اب تجسس میں مبتلا ہیں۔ ایک میڈ کے لیے تم اتنے پُر تجسس ہو۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سویٹ ڈش کا ٹرے رکھنے آئی۔ تو سب اُسے دیکھنے

گئے۔ وہ حجاب میں تھی۔ اُس نے کچھ برتن اُٹھائے اور نئے برتن سامنے رکھے۔ وہ تیزی سے واپس مُڑ گئی۔ صفدر سے رہا نہ گیا۔ رضا تمہارے سامنے بھی پردے میں رہتی ہے۔ ویسے کسی میڈ کو میں نے آج تک پردے میں تو نہیں دیکھا۔ سُنو اس کی زندگی مزید سنور سکتی ہے۔ اگر یہ پردہ اُتار دے۔ اُس نے دائیں آنکھ دبا کر صفی کو دیکھا۔

رضا خان کو اس کی اس حرکت پر غصہ آ گیا۔ صفدر تمہیں شرم آنی چاہیے۔ ہر عورت کے بارے لُچر خیالات ہر جگہ نہیں چلتے۔ کیا سمجھتے ہو۔ ہر عورت راہ چلتے آوارہ اور بدچلن ہوتی ہے۔ یا تم جیسے مردُ اسے ایسا بناتے ہو۔ صفی نے لقمہ دیا۔ جذباتی پن نہیں یار۔ اتنی عمریں گذار لینے کے بعد بھی کیا ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہے۔۔ کیا عورت کو صرف جنس کے حوالے سے ہی دیکھنا چاہیے۔ کیا وہ جنس کے باہر کوئی حثیت نہیں رکھتی۔ مرد کی سوچ ان کی ٹانگوں کے بیچ میں کہیں اٹک جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے۔

اچھا یار سوری! تمہیں بُرا لگا۔ بُرا تو لگا ہے۔ چلو چھوڑو، کھانا کھاؤ۔ پھر گپ شپ کرتے ہیں۔ ناصرہ نے چیزیں لاتے ہوئے سب سُن لیا تھا۔ اُسے رضا صاحب بڑے اچھے، نیک، ہمدرد انسان لگے۔ جو عزت کرتے ہیں۔ اُس کے دل میں ان کی قدر اور بڑھ گئی۔ ایک دن سٹڈی میں بیٹھے اطلاعی گھنٹی بجی۔ کون ہے بھئی آ جاؤ۔ انکل میں وجاہت علی۔ ارے بیٹا آ جاؤ۔ کہاں ہوتے ہو؟ کبھی ارسلان کے ساتھ گھر آتے تھے۔ اب تو بھول ہی گئے ہو۔ نہیں نہیں انکل ایسی بات نہیں۔ بس ذرا پی ایچ ڈی کے تھیسس کی تیاری میں بزی رہا۔ اب تھیسس جمع ہو گیا ہے۔ سوچا آپ سے خیریت پوچھ لوں۔ اور ارسلان سے کافی دنوں سے رابطہ نہیں ہوا۔ کال بھی اٹینڈ نہیں کر رہا۔ میں نے بھی کافی کوشش کی ہے۔ بس موڈ کا بندہ ہے۔ خود ہی جب موڈ میں آئے گا تو رابطہ کرلے گا۔ جی یہ بھی ٹھیک ہے۔ رضا خان صاحب چائے لے آؤں، اچانک ہی ناصرہ کہیں سے وارد ہوئی۔ ہاں بھئی ناصرہ۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی لے آؤ۔ یہ ارسلان بابا کے دوست ہیں۔ نہیں انکل اس کی کیا ضرورت ہے۔ ارے کیوں نہیں۔ رضا خان نے اصرار کیا۔ ناصرہ آڈر لے کر چلی گئی۔ اور بیٹے تمہارے بابا کیسے ہیں۔ کچھ بیمار ہیں آج کل۔ بس ریٹائرڈ لائف کی پریشانی۔ ہاں بھئی۔ انکل یہ خاتون کون ہیں۔ یہ نئی میڈ رکھی ہے۔ میرا خانساماں بغیر بتائے چلا گیا ہے۔ تو آپ نے پتہ نہیں کیا۔ بہت مرتبہ فون کیا کوئی اُٹھاتا ہی نہیں۔ اُس کے گھر کا مجھے پتہ نہیں۔ ہاں ہم نے اُس کے ہاتھ کی بہت سی چیزیں کھائی ہیں۔ وجاہت نے خانساماں کو یاد کیا۔ چلو ایک مرتبہ پھر اُس کا نمبر ٹرائی کرتا ہوں۔ اور پورے ڈیڑھ مہنے بعد اچانک ہی نمبر مل گیا۔

کون بات کر رہا ہے؟ مجھے محمد علی سے بات کرنی ہے۔ وہ میرے ہاں کام کرتا تھا۔ آپ رضا صاحب بات کر رہے ہیں۔ دوسری طرف سسکیاں سُنائی دینے لگیں۔ وہ تو ڈیڑھ ماہ پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں وفات پا گیا تھا۔ سسکیاں تیز ہوئیں اور رضا صاحب دکھی ہو گئے۔ مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔ اتنا پرانا ملازم تھا۔ میں نے کئی مرتبہ فون کیا۔ کوئی اُٹھاتا ہی نہیں تھا۔ رضا صاحب نے شکوہ کیا۔ سر اُس کا موبائل بھی دو دن پہلے ہی ملا ہے۔ گم ہو گیا تھا۔ اچھا مجھے ایڈریس بتائیں۔ میں تعزیت کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ فون بند ہو گیا۔ یار یہ تو بُرا ہوا۔ ابھی جوان آدمی تھا۔ جی انکل دُکھ ہوا سُن کر۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ او کے۔ میں جاؤں گا اُس کے گھر کچھ مدد کروں گا اُن لوگوں کی۔ اُس نے آخر بہت خدمت کی ہے میری۔ جی انکل ضرور ایسا ہونا چاہیے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ وہ مُسکرایا۔

ہفتے بھر بعد ہی ارسلان کا وڈیو کال موصول ہوا۔ بابا آپ نے گھر میں عورت رکھ لی ہے۔ ہاں بیٹا اُس نے بڑے اچھے سے گھر سنبھال لیا ہے۔ خانساماں بے چارہ وفات پا گیا ہے۔ کچھ تو کرنا تھا ناں۔ تو بابا کوئی اور خانساماں رکھ لیتے۔ بیٹے آپ کو کیا اعتراض ہے۔ آپ امریکہ میں بیٹھ کر مجھ پر اعتراض کریں گے۔ جیسے تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔ میں بھی تو تمہارا باپ ہوں۔ رضا خان کو غصہ آ گیا۔ سوری بابا۔ میرا مطلب گھر پر قبضہ ہی نہ جما لے۔ بیٹے آپ لوگوں کو سب جائیداد میں مناسب حصہ مل چکا۔ یہ میرا گھر میری کمائی اور پسند سے بنا ہے۔ اور یہ میں جسے چاہوں گفٹ کروں۔ اِس پر آپ کا اعتراض بنتا ہی نہیں۔ مہینوں بعد فون کر کے باپ کی خریت دریافت کرنے کی بجائے آپ کو گھر کی پڑی ہے۔

بابا آپ ہمارے بابا ہیں۔ آپ کی فکر ہو رہی تھی۔ ارے ماشاللہ میرے چاند! ماں کی صورت تو دیکھنے آ نہیں سکے تھے۔ جس نے آپ کی خاطر زندگی لٹا دی۔ اور میری فکر ہونے لگی۔ رضا خان کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ بیٹا جی آپ اپنی زندگی میں مگن اور خوش رہیں۔ یہ معاہدہ طے پا گیا تھا۔

اور میں نے اپنی زندگی میں مداخلت کا اِختیار آپ کو نہیں دیا۔ رہی اِس عورت کی بات تو میں اُس کے کام سے خوش ہوں۔ گھر کی بابت تم فکر نہ کرو۔ شایان سے کبھی ملاقات ہو تو بتانا ایک عدد باپ بھی پاکستان میں رہتا ہے۔ جسے پلٹ کر کبھی دیکھا نہیں تم لوگوں نے۔ حتیٰ کہ بلی بھی مصروف ہو چکی ہے۔ تین ماہ سے اُس نے کال نہیں کی۔ اللہ ایسی خود غرض اولاد پر رحم کرے۔ خوش رہو۔ اللہ حافظ۔ رضا نے کافی تلخی سے فون بند کر دیا۔ اچھی محبت اور خبری سلامت رہو میرے بچے۔

گیری ہے کہ باپ نے عورت کیوں رکھ لی۔ وقت اپنی رفتار سے سرکتا رہا۔ رضا صاحب کو کسی دوست کی طرف جانا تھا۔ وہ چلے گئے۔ ناصرہ گھر کے جملہ اُمور طے کر کے، کھانا بنا کر، بچے کے ساتھ گارڈن میں چلی آئی۔ دُھوپ چھاؤں کا بڑا سُہانا منظر تھا، وہ بچے کے ساتھ کھیلنے لگی تھی۔ وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اچانک اُس کی ہنسی کی آواز ہوا کے دوش پہ لہراتی رضا کے کانوں تک پہنچی۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آئے تھے۔ اُنہوں نے سٹڈی کی کھڑکی سے جھانکا جہاں گارڈن کا سارا منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دُھوپ چھاؤں کے منظر میں کھلے بالوں کے ساتھ حسین چہرہ لیے وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق نظر آتی تھی۔

پینسٹھ برس کی عمر تجربے، مشاہدے اور حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایک ملازمہ آخر کتنی حسین نظر آ سکتی ہے۔ اُنہوں نے سوچا مگر یہ حقیقی منظر تھا۔ کیا یہ واقعی ایک غریب عورت ہے۔ یا اس نے سوانگ بھر رکھا ہے۔ اپنے چہرے مہرے، حلیے، رکھ رکھاؤ، آداب، شائستگی، پڑھا لکھا ہونا قطعاً یہ ظاہر نہیں کرتے تھے کہ وہ کوئی معمولی عورت ہے۔ وہ تھی بھی بڑی دراز قد اور جوان۔ اور میں شدید بوڑھا ہوتا ہوا ایک آدمی۔ رضا خان نے سر جھٹکا۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میری پناہ میں ہے۔

وہ ان حسین خیالوں کو جھٹک کر اخبار کے مطالعے میں گم ہو گئے۔ سر کھانا لگ گیا ہے۔ یہ کوئی جادوگر کی بچی ہے کہ فٹافٹ سب تیار۔ ہاں آپ کھانا لگاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔ وہ اپنی خوشبو وہاں چھوڑ گئی تھی۔ کیا کروں۔ اب یہ میرے لیے آزمائش اور پھندا ہی رہے گی۔ چلو اس کی شادی کروا دیتا ہوں۔ اُنہوں نے بہترین حل سوچ لیا۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ ابھی بیٹھے اور نیپکن پکڑا ہی تھا کہ وہ ایک اور ڈش رکھنے آئی۔ ناصرہ۔ جی صاحب۔ اِدھر بیٹھو نہیں نہیں صاحب۔ آپ بات کیجئے۔ تم بیٹھو پھر بات کرتا ہوں۔ آؤ آج میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ نہیں رضا صاحب۔ ناصرہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ آپ مالک ہیں۔ میں ملازم۔ آپ کے برابر نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ فرسودہ باتیں ہیں۔

یہ جدید دور ہے۔ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ سب برابر ہیں۔ تم سے کچھ بات کرنی تھی۔ بیٹھو۔ جی رضا صاحب۔ وہ سائیڈ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کھانا ڈالو۔ جی۔ اُس نے جلدی سے کھانا نکالا۔ تھوڑا سا اپنے لیے بھی نکالا۔ بیٹا کدھر ہے۔ سو گیا ہے۔ کافی کھیلا آج۔ اِس کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو۔ جی صاحب رکھتی ہوں۔ آپ کا شکریہ۔ سب کچھ آپ کا ہی تو دیا ہوا ہے۔ میرا نہیں۔ رضا نے سختی سے تردید کی۔ خدا کا دیا ہوا ہے۔ جی صاحب۔ اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو آپ کی شادی کی بات کروں کسی سے، کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر۔ آپ ابھی جوان ہیں۔ خوبصورت ہیں۔ کب تک گھروں میں کام کریں گی۔ آپ کا اپنا گھر ہونا چاہیے۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے چُپ رہی۔ میں شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے بچے کی حفاظت کرنی ہے۔ اس کے باپ کے قاتل اِسے بھی مار ڈالیں گے۔ وہ ہماری تلاش میں رہتے ہیں۔ بڑے مسائل ہو جائیں گے۔ آپ کچھ بتائیں گی اپنے بارے میں۔ تب ہی تو آپ کی مدد کر پاؤں گا۔ کسی اچھے شخص سے شادی ہو گئی تو وہ بخوبی آپ لوگوں کی حفاظت کر پائے گا۔

ایک بات کہوں۔ کہو۔ رضا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ ناصرہ نے کہا۔ نہیں بولو۔ سُن رہا ہوں۔ آپ کی بیوی نہیں، اتنا بڑا گھر خالی پڑا ہے۔ اور آپ اکیلے ہیں۔ آپ کو بھی تو سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے بارے میں ایسا کیوں نہیں سوچتے۔

آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ ذرا سنبھل کر بولے۔ مگر میں نے زندگی کا بہترین وقت بہترین طریقے سے گذار لیا ہے۔ اب کوئی طمع، کوئی لالچ نہیں ہے۔ اور ضرورت بھی نہیں ہے۔ اُنہوں نے پوری قطعیت سے انکار کیا۔ میں نے بھی بہترین وقت گذار لیا۔ اب کوئی خواہش نہیں۔ بیٹے کو پالوں گی۔ بس، اُس نے بھی قطعی فیصلہ سُنایا اور اُٹھ گئی۔

یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ وہ کتنی ہی دیر سوچتے رہے۔ جوان عورت ہے اور اس گھر میں دوسری کوئی عورت نہیں۔ کل کلاں کو لوگ باتیں بنائیں گے۔ یکدم اُنہیں اس بات کا احساس ستانے لگا۔ دوستوں کے رویے سے وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر سوچ میں ڈوبے رہے۔ ناصرہ اُنہیں کچن کی کھڑکی سے مسلسل دیکھتی رہی۔

رضا صاحب نے مجھے گھر سے نکال دیا تو کہاں جاؤں گی۔ وہ سوچتی چلی گئی۔ بچے کو بچانا ہے۔ خود کو بھی بچانا ہے۔ زمانہ اور حالات بہت بُرے ہیں۔ رضا صاحب بے شک اکیلے ہیں۔ پیسے والے ہیں۔ مگر وہ مجھے اپنائیں گے نہیں کہ ان کا سٹیٹس خراب ہو گا۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔ میں ایک غریب عورت۔ ایک ملازمہ۔ ایک بچے کی ماں۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی، جب اچانک رضا صاحب اُدھر آ نکلے۔ ناصرہ۔ وہ چونک گئی۔ جی رضا صاحب۔ چائے کا کپ سٹڈی روم میں بھجوا دو۔ جی صاحب۔ ابھی لائی۔ اُس نے سعادت مندی اور عقیدت سے کہا۔ رضا صاحب میرے لیے کتنا اچھا سوچتے ہیں۔ یہ کوئی ایسے بڈھے بھی نہیں ہیں۔ شاندار پرسنیلٹی ہے کم از کم مجھے تو پسند ہیں۔ اتنے مہربان۔ اتنے شفیق۔ وہ چائے بناتے ہوئے اُنہی کے بارے سوچنے لگی۔ کیا مصیبت ہے۔ اُس نے ذہن کو جھٹکا۔ یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بھی لگا ہے۔ وہ چائے

بنا کر سٹڈی میں پہنچی۔ رضا صاحب لیپ ٹاپ پر جھکے کسی کام میں مگن تھے۔ چائے۔ ہاں رکھ دو۔ وہ اتنے بے خبر بھی نہیں تھے۔ اُس نے کچھ کاغذ ہٹا کر جگہ بنائی اور چائے رکھ دی۔

وقت کی ریت دھیرے دھیرے پھسلنے لگی۔ ایسے ہی ایک روشن دن میں اچانک اُنہیں کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز سُنائی دی۔ کون ہے باہر۔ دیکھتا ہوں۔ وہ باہر نکلے تو سامنے ہی مسز جمشید کھڑی تھیں۔ میجر (ر) جمشید علی کی بیگم۔ جو اپنی بیوہ بہن کا گھر بسانے کے لیے کئی مرتبہ ملتے ملاتے اشاروں کنائیوں میں رضا صاحب سے ذکر کر چکی تھیں۔ رضا صاحب کی سرد مہری دیکھ کر وہ چُپ ہو جاتیں۔

مسز جمشید کیسی ہیں آپ۔ آج کیسے آنا ہوا۔ رانی حمیدہ آئی ہوئی ہیں کراچی سے۔ آپ کو پتہ ہے وہ سکول چلا رہی ہیں کراچی میں۔ آپ سے ملوانا چاہتی تھی۔ کیوں؟ وہ گڑبڑائے۔ وہ آپ سے کئی دفعہ ذکر کیا ہے۔ کب تک اکیلے رہیں گے۔ دیکھیے مسز جمشید میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میری معذرت قبول کریں۔ جی رضا صاحب جب ایک جوان خوبصورت ملازمہ مفت میں مل جائے گی۔ تو آپ کیوں ایسا سوچیں گے۔ مسز جمشید کے اس طنزیہ جملے پر وہ تپ ہی گئے۔ الزام لگانا شیطان کا کام ہے۔ آپ چلی جائیں یہاں سے۔ میں اس پر مزید کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ مسز جمشید بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

ناصرہ بے چین اور شرمندہ سی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں یقیناً آنسو بھی تھے۔ مجھے افسوس ہے رضا صاحب۔ میری وجہ سے۔ نہیں ناصرہ۔ آپ کی وجہ سے نہیں۔ یہ خاتون پچھلے دو سال سے مجھے پریشان کر رہی ہے۔ لالچی عورت ہے۔ اور اس کی لالچی بہن سے میں ہرگز نکاح نہیں کر سکتا۔ وہ ضرور اس گھر پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ مجھ سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہر بندے کا کوئی نہ کوئی لالچ تو ہوتا ہے ناں۔ رضا صاحب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ تم جاؤ۔ کام کرو۔ میں بہت اُلجھ گیا ہوں۔ بندہ مر رہا ہو تو کوئی پوچھتا نہیں۔ اور ہوس میں لوگ اندھے ہو جاتے ہیں۔

وہ باغیچے میں جا بیٹھے۔ ننھا رضوان وہیں چلا آیا۔ تو وہ اُس سے باتیں کرنے لگے۔ اُسے ٹافیاں دینے لگے۔ اُن کا ذہن کافی حد تک بہل گیا۔ اُنہیں اکیلے ہی فیصلہ کرنا تھا۔ اس زندگی میں اُن کی اُلجھنوں کا فیصلہ۔ مجبوری ہے کہ میں ناصرہ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مگر لوگ اِک جوان عورت کو گھر میں رکھنے پر شک کرتے رہیں گے۔ رضا صاحب نے صفی الدین کو کال کر کے گھر بلایا اور اس مسئلے پر کافی دیر تک بات کرتے رہے۔ دیکھو رضا خان اگر ناصرہ خاتون راضی ہو تو تم اُس سے نکاح کر لو۔ یہ گناہ تو نہیں۔ اُسے گھر اور تحفظ مل جائے گا۔ اُس کا بچہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ تمہاری اُداسی اور تنہائی بھی دُور ہو جائے گی۔ ویسے بھی اُس نے بہت عمدگی سے اس گھر کو سنبھال لیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ پہلے اُس سے پوچھو تو۔ مجھے بتا دینا۔ میں نکاح کا انتظام کر لوں گا۔ ٹھیک ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رضا صاحب کو یہ بڑا فیصلہ لینا پڑا۔

وہ آتش دان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ناصرہ کافی لے آئی۔ بیٹھو ناصرہ۔ ضروری بات کرنی ہے۔ جی رضا صاحب۔ کہیے۔ آپ زمانے کی اُونچ نیچ سے واقف ہیں۔ میری اُلجھنوں اور مسائل سے بھی۔ ایک جوان عورت کو اس گھر میں لوگ رہنے نہیں دیں گے۔ مفت کی بدنامی ہاتھ آ رہی ہے۔ آپ بھی کہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ اگر آپ اس بات پر رضا مند ہوں۔ تو آپ سے عقد ثانی کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ اور آپ کا بچہ دونوں محفوظ ہو جائیں۔ گھر مل جائے۔ میں خود اپنے لیے نہیں آپ کے بارے میں فکر مند ہوں۔

بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔ آپ انکار بھی کریں گی تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔ یہ آپ کا حق ہے۔ اِس گھر میں تحفظ اور احترام آپ کو حاصل رہے گا۔ وہ سر جُھکائے شعلوں کو جلتے بجھتے دیکھتے رہے۔ بالکل خالی الذہن تھے۔

اچانک ہی ناصرہ نے ہاتھ بڑھا کر رضا خان کا ہاتھ اپنے نرم گرم ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ اچانک حملہ تھا۔ رضا اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ جیسے کرنٹ لگا ہو۔ یا کسی چنگاری نے اُڑ کر اُنہیں تڑپا دیا ہو۔ رضا صاحب مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے۔ آپ کو کبھی میری وجہ سے پریشانی نہیں ہو گی۔ آپ کی خدمت میرا فرض۔ آپ کا شکریہ۔

آپ نے ایک دُکھی، غریب اور بیوہ عورت کو سہارا دینا پسند کیا۔ اُس نے رضا کے ہاتھ پر اپنے گرم ہونٹوں کا بوسہ ثبت کیا اور تیزی سے اُٹھ گئی۔ وہ حیرت سے اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ کیسی آگ لگا گئی تھی۔ اِس کا مطلب کہ وہ پہلے ہی ذہن بنا چکی ہے اُسے اور کیا چاہیے۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ مسز آصف رضا خان بن کے اُن کے ذاتی بیڈروم میں موجود تھی۔ حجاب کے بغیر سادہ سے پنک سوٹ میں وہ قیامت لگ رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی خوبصورت ہو۔ میں آپ کے لیے آپ کے صبر اور استقامت کا انعام ہوں۔

وہ اُن کے مضبوط بازوؤں میں سما گئی۔ رضا اُس کی حسین زلفوں میں منہ چُھپائے کتنی ہی دیر اپنے ہونے کا یقین کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے۔ یہ فیصلہ بھی آسمانوں پر کہیں پہلے ہی لکھا جا چکا تھا۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ دونوں اس فیصلے سے خوش تھے۔

چوبیس برس بیت گئے

رابنسن سیموئیل گل/ راولپنڈی

یادیں بھی عجب شے ہوتی ہیں، ذہن میں ہی ہوتی ہیں مگر کبھی کبھی یاد آ جاتی ہیں۔ ایسا ہی ہے؛ باتیں بھول جاتی ہیں، یادیں یاد آتی ہیں۔ آج یونہی قائدِ اعظم یونیورسٹی کی بھولی بسری یادیں یاد آنے لگیں۔ یوں لگتا ہے کہ مَیں صبح جاگوں گا، اُسی جگہ پر جاؤں گا جہاں مَیں اور میرے دوست دن کا بیشتر حصہ اکٹھے گزارتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے سے بور نہیں ہوتے تھے۔ باتیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ساتھ ختم ہو جائے گا مگر باتیں ختم نہ ہوں گی۔ ہم یونہی ملتے رہیں گے، ایک دوسرے کی غمی خوشی، دکھ سکھ میں شریک ہوتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کو یاد رکھیں گے، ایک دوسرے کی باتیں یاد رکھیں گے مگر زندگی اپنی ڈگر پر چلتے ہوئے انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے... نہ وہ بات رہتی ہے، نہ وہ ساتھ رہتے ہیں، نہ وہ تعلقات رہتے ہیں، نہ وہ حالات رہتے ہیں، نہ وہ وقت رہتا ہے اور نہ ہی وہ لمحات رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ وہ کندھے رہتے ہیں جن کا سہارا دائمی معلوم ہوتا ہے، نہ وہ ہاتھ رہتے ہیں کہ جن کو تھامے زندگی کی مشکل اور کٹھن پگڈنڈیوں سے انسان با آسانی گزر جاتا ہے۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہتا... سوائے یادوں کے... سوائے اُن باتوں کے جو بنا سیاق وسباق جھلکیوں کی صورت یاد رہ جاتی ہیں... وہ آخری جملے جو ہم سب دوستوں نے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے کہے تھے کہ اب ساتھ میں تو نہیں رہیں گے مگر ایک دوسرے کی یاد میں رہیں گے اور پھر یادوں کے مٹنے سے پہلے ایک بار پھر تجدیدِ عہدِ وفا کر لیا کریں گے...

یہی تھے وہ آخری جملے جو ہم نے ایک دوسرے سے بچھڑتے ہوئے، جدا ہوتے ہوئے کہے تھے کہ پانچ برس بعد بعد پھر ملیں گے اور پھر اسی طرح دس برس بعد جہاں کہیں بھی ہوں گے، ایک دوسرے سے رابطہ کر کے واپس قائدِ اعظم یونیورسٹی میں، اپنے انٹرنیشنل ریلیشنز کے ڈیپارٹمنٹ میں آئیں گے، مل کر بٹس پر جائیں گے، سٹریم (ندی) کے بہتے پانیوں سے لطف اٹھائیں گے۔ ایک دوسرے سے ملنے، ایک دوسرے کو دیکھنے، ایک دوسرے کا حال دریافت کرنے آئیں گے... ہاں یادوں کے مٹنے سے پہلے... ایک بار پھر آئیں گے... مگر اب تو چوبیس برس گویا صدی کا ایک چوتھائی حصہ بیت گیا۔ نہ جانے کبھی کسی نے مجھے یاد کیا...؟ کیا مَیں نے کسی کو یاد کیا؟ شاید وہ دوست کبھی بھولے ہی نہیں اور نہ ہی بھلائے جا سکتے ہیں۔ بہت دفعہ اپنی ڈائری میں اُن یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی، ترتیب وار لکھنے کا قصد کیا مگر پھر خیال آتا کہ کس کے لیے لکھوں، کون پڑھے گا، کیوں پڑھے گا؟

یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کسی کو نہیں بھولا اُسی طرح کوئی بھی کسی کو نہیں بھولا ہوگا۔ سب نے اچھی اور خوش گوار یادیں سمیٹی تھیں۔ ہاں کچھ کو زخم بھی لگے تھے، کچھ نے گھاؤ بھی کھائے تھے... گہرے گھاؤ... خاص طور پر اُنہوں نے جو گہرے تعلقات میں بندھ گئے تھے۔ اکٹھے چل بھی نہ سکتے تھے مگر ایک دوسرے کے ہم سفر بن بیٹھے تھے۔ بعض تو اکٹھے چل بھی پڑے تھے مگر پھر نبھا نہ سکے، مل کر منزل کو پا نہ سکے۔ ناطہ ٹوٹا تو زیادہ گھائل ہوئے... زیادہ زخم کھائے اور زندگی خوش گوار سفر کی بجائے سزا بن گئی۔ وہ تلخ یادیں تو اُنہیں بھی بے چین کرتی ہوں گی۔ نہ جانے وہ ماضی کے اُن اوراق کو پلٹ کر، اُن پر سے گرد جھاڑ کر اُن لفظوں کو پڑھنا چاہیں گے جو اُنہوں نے مل کر تحریر کیے تھے، خود ہی تحریر کیے تھے۔ وہیں اپنی قسمت کے فیصلے لکھ ڈالے تھے اور ایسی ڈوریوں میں بندھ گئے تھے جو کچے دھاگے ثابت ہوئے... جلد ٹوٹ گئے۔ اب اُن ٹوٹے دھاگوں میں آنسوؤں کے موتی پروئے جاتے ہیں... شاید روزانہ اُن موتیوں کی تسبیح پڑھی جاتی ہے کہ زندگی کی شمع گل ہونے تک آنسوؤں کی وہ جھڑی، صاف شفاف و بے رنگ موتیوں کی وہ لڑی، اسی طرح جاری رہے گی کہ اُس دور نے اُن کے مقدر میں آنسوؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ لکھ ڈالا۔

شاید وہ ساتھ اچھے رہے جو دلوں میں حسرت لے کر، کسی کے لیے اپنے اندر چاہت لے کر تشنگی کے عالم میں آگے بڑھ گئے۔ زخم تو اُنہیں بھی لگے، گھائل تو وہ بھی ہوئے لیکن محبوب کی یاد کے سہارے جینا، اِس آس میں زندگی بتا دینا کہ کاش جس کو مَیں چاہتا تھا، وہ مجھے مل جاتا، میرا ہم سفر ہو جاتا، میرا ہو جاتا... اُس کی حسین یاد اور اس آس میں زندگی بیتانا تکلیف کم اور لطف زیادہ دیتا ہے کیوں کہ خواہش کا دل میں رہنا،

خواہش کی تکمیل سے زیادہ خوشی و تسکین دیتا ہے۔ محبوب کی یادوں کے سہارے زندگی گزارنے والا اپنے محبوب کو تخیل میں ہر وقت اپنے قریب رکھ سکتا ہے، اُس کے متعلق جو بھی چاہے سوچ سکتا ہے مگر جب محبوب حقیقت میں مل جاتا ہے تو حقیقت محدود ہوتی ہے۔ حقیقت کا تصور یا تخیل سے تعلق نہیں ہوتا۔ حقیقت کا اُسی طرح سامنا کرنا پڑتا ہے جس طرح وہ آپ کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ آپ اُس کو بدل نہیں سکتے، اپنی مرضی کے مطابق ڈھال نہیں سکتے۔

ہاں اُس دور میں بعض نے اچھی یادیں سمیٹیں اور بعض تلخ یادیں لے گئے۔ زندگی تلخ و شیریں تجربات کا مجموعہ اور نشیب و فراز سے پُر شاہراہ ہے۔ اچھا تو یہی ہوتا ہے کہ انسان زندگی کے ہر موڑ پر اچھی یادیں سمیٹ لے اور تلخ کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے ورنہ تلخ یادوں سے بھری گٹھڑی ہماری پوری زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔

قائدِ اعظم یونیورسٹی کی ایک ایک خوش گوار یاد بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں کوندتی ہے اور پھر اُسی طرح میں معمولاتِ زندگی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ شاید اپنی کسی پاکٹ سائز نوٹ کاپی میں یوں برق رفتاری سے آنے والی بعض یادوں کو مختصراً قلم بند کر لیا ہو کہ کبھی اس پر طویل مضمون لکھوں گا مگر وہ یادیں میرے ذہن سے آزاد ہو کر اُن اوراق میں تو قید ہو گئیں مگر سچ میں کبھی مَیں نے اُن کو آزاد نہیں کیا۔ وہ اب بھی قید ہیں بس اُن کا مقام تبدیل ہو گیا ہے۔ مَیں نے پنجرے کو تو بدل ڈالا تھا مگر یادوں کی خوب صورت فاختہ اب بھی آزاد فضاؤں میں پھڑ پھڑاتی اور پر مارتی کسی کو دکھائی نہیں دیتی کہ وہ بے چاری تو اب بھی قید ہی ہے۔ ایک مصنف یا ادیب اس بات سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ زندگی کی اچھی بُری یادیں اُس کے وجود کے ساتھ امر بیل کی طرح لپٹی رہتی ہیں۔ وہ اُن سے صرف تب ہی خلاصی حاصل کر پاتا ہے جب کسی تحریر، الفاظ، کہانی، افسانے یا مضمون میں اُن یادوں کو ڈھال کر دُنیا کے سامنے لے آتا ہے۔ یوں جب وہ یادیں دوسروں تک منتقل ہو جاتی ہیں تو وہ ایک عجیب سی تسکین پاتا اور اپنے آپ کو بہت زیادہ ہلکا محسوس کرتا ہے گویا آزاد فضاؤں میں اڑنے والی وہ فاختہ محض اُس کی یادیں نہیں بلکہ وہ خود ہو جو ہوا کے دوش پر آزاد فضاؤں میں اڑتا پھرتا ہے۔

کیا کبھی آپ کو کسی بوڑھے شخص کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے؟ وہ چاہے گا کہ کچھ ہی دیر میں اپنے بچپن سے لے کر زمانۂ طالب علمی، جوانی اور ادھیڑ عمر تک کی یادوں کو آپ تک منتقل کر دے۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کے پاس بھی بیٹھ کر دیکھیں، وہ اپنے والدین کی باتیں، اپنے بچپن کی یادیں، گاؤں کی باتیں، پرانے دوستوں کے قصے کہانیاں... سب کچھ آپ کو سنانا چاہیں گے۔ کبھی اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے نکال کر ایسوں کے پاس بیٹھیں۔ شوق سے اُن کی باتوں کو سنیں۔ بناء قطع کلامی کیے، دل چسپی کا اظہار کریں، مزید سننے کی خواہش ظاہر کریں... یقین کیجیے جب کچھ لحات آپ اُن کی یادوں کو سن کر اُن سے جدا ہوں گے تو وہ بھی اپنے آپ کو کسی فاختہ کی مانند آزاد فضاؤں میں اڑتا محسوس کریں گے، اپنے دل کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔

شاید مَیں بھی اب چالیس کے پیٹے میں پہنچ کر زندگی کو یوں دیکھ رہا ہوں کہ گویا پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ کر اب نیچے کو اترنے کا وقت آ گیا ہے، اس لیے گزرے وقت اور بیتے لمحوں کی یادیں بانٹنا چاہتا اور اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر شخص ہی اپنی آپ بیتی، زندگی کی سرگزشت اور سوانح عمری لکھنا چاہتا ہے۔ اپنی زندگی کو کتاب کی صورت اپنی نسل، اپنی اولاد، اپنوں کے لیے بلکہ دنیا کے لیے چھوڑ کر جانا چاہتا ہے مگر ہر ایک کے پاس یادوں کو لفظوں میں ڈھالنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لکھنے والوں کو یہ خداداد صلاحیت تفویض ہوتی ہے کہ اپنی یادوں کو لفظوں کے موتیوں میں ڈھال کر زندگی کی ڈوری میں کچھ اس طرح پروتے ہیں کہ وہ ایک خوب صورت مالا بن جاتی ہے۔

چوبیس برس بیت گئے... آج نہ جانے کیا کیا اور کون کون یاد آ گیا؟ مَیں یونیورسٹی کے اُس دور کی اِس قدر خوش گوار یادیں سمیٹ سکا کہ دل میں کوئی خلش کوئی ملال باقی نہ رہا۔ یادوں کو آنسوؤں کے شفاف موتیوں میں نہیں بلکہ لفظوں کے رنگین موتیوں میں ڈھال کر زندگی کی ڈوری میں پرو سکا۔ ڈھلتی عمر میں جی چاہتا ہے کہ پھر سے دوستوں کو ملوں، اُن لمحوں کو پھر سے جیا جائے جنھوں نے زندگی میں کبھی زندگی کا رنگ گھولا تھا...

مگر اب... اب تو واپسی ممکن نہیں!

زہرا قرار/ممبئی مہاراشٹر (بھارت)

آج کل بات بھی نہیں کرتا   لمبی تمہید باندھنے والا

زہرا قرار کا تعلق ممبئی سے ہے۔ وہ 9 فروری 1984 کو پیدا ہوئیں۔ آپ نے ممبئی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور بی ایڈ مکمل کیا ہے۔ فی الحال آپ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے انھوں نے 2013 میں غزل کہنی شروع کی۔ آپ دورِ جدید میں عورت کے وجود سے جڑے پرانے اور نئے احساسات وجذبات کو بہت ہی ہنرمندی سے شعری پیکر میں ڈھالتی ہیں۔ جہاں آپ کا اسلوب نیا اور منفرد ہے وہیں آپ نے اپنی غزلیات میں نئے مضامین بھی بڑی خوبصورتی سے قلم بند کیے ہیں۔ اس پر کمال یہ ہے کہ ان کے ذریعے قلم بند کیے گئے یہ مضامین عورت کی بدلتی ہوئی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی نفسیات کے بے شمار پہلو زہرا قرار کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ شعرا میں میر تقی میر، شکیب جلالی، ثروت حسین اور عرفان صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔

کاٹنے پر وہ پھل سڑا نکلا
عشق کا تجربہ برا نکلا
تیرگی روشنی کے حق میں تھی
چور کی جیب سے دیا نکلا
اتنی تنگی میں چائے پینی تھی
پانچ کا نوٹ بھی پھٹا نکلا
گونجی تکبیر کی صدا اور پھر
شان و شوکت سے قافلہ نکلا
اس کو کچھ پیڑ کاٹنے تھے مگر
وہ مری بات کاٹتا نکلا
بستیاں دور ہو گئیں آباد
اور مکانوں سے راستہ نکلا
اس طرف اتنا شور تھا زہرا
جانے کس کی زباں سے کیا نکلا

غیر ہو یا کوئی سگے والا
کون ہے اپنا پوچھنے والا
کوئی کتنا سنبھال کر رکھ لے
ٹوٹ جاتا ہے ٹوٹنے والا
گھر میں گلدان کی جگہ نہیں ہے
پھول لایا ہے سامنے والا
برقعے پہنے زمیں کو چھوتے ہوئے
سوٹ پہنا کھلے گلے والا
کیا ہوئی بھیڑ تیرے ساحل پر
کیا ہوا وہ ترا گھڑے والا
کیسے چھتری خرید سکتا ہے
میری بارش میں بھیگنے والا
آج کل بات بھی نہیں کرتا
لمبی تمہید باندھنے والا
اس کے معیار کو نہیں پہنچا
کوئی مصرع مبالغے والا
باپ کے بعد کوئی بھی نہیں تھا
بھائی کے کان کھینچنے والا

فضا میں دور تلک صرف بے بسی ہو گی
وہ بس پکڑنے کو جس وقت بھاگتی ہو گی
غلط ہے یہ اسے فون کیوں لگا رہے ہو
وہ لڑکی رات کے اس وقت پڑھ رہی ہو گی
میں اس سے مل نہیں پائی تھی ان دنوں شاید
یہ بات میں نے اسے بعد میں کہی ہو گی
جہاں پہ ہاتھ چھڑایا تھا تم نے رستے میں
وہیں کہیں پہ انگوٹھی مری گری ہو گی
اکیلے پن کی جو دنیا بسائی ہے اس نے
وہ سج سنور کے بھی گھر میں ہی بیٹھتی ہو گی
گلاس پر بھی نشاں میری انگلیوں کے ہیں
گلاس میں بھی محبت کی چاشنی ہو گی
اگر یہ حال ہے دروازے اور دریچوں کا
کتاب پر تو بہت دھول جم گئی ہو گی
تمہارے ہوتے ہوئے ہے مجھے پریشانی
تمہارے عشق سے اچھی تو نوکری ہو گی
قرار ڈھونڈ کے لائیں وہ اچھے دن کیسے
اب ان دنوں پہ فقط اچھی شاعری ہو گی

ثانیہ شیخ

مری جاں
آنسوؤں کا نمک
گلے میں گھل رہا ہے
سانس میں بھر دے
موتیے کی مہک
کوئی بات تو کر

تم اچانک ہنس دیے
پھول کتنے گر گئے
میں نے آنچل بھر لیا

کتنی خاموشی ہے
آ کے ہنس دے
تیری آواز کے پھول
میں کانوں میں پرو لوں

ہر کہی ان کہی سمجھتا ہے
دل تری خامشی سمجھتا ہے
چپ یونہی بے سبب نہیں رہتا
وہ مری شاعری سمجھتا ہے
دل کو الجھا نہ یوں سوالوں میں
یہ تیری سادگی سمجھتا ہے
ہر کسی سے نہیں کیا کرتے
بات کب ہر کوئی سمجھتا ہے
جو سمجھتی ہوں میں تجھے ہمدم
کیا مجھے تو وہی سمجھتا ہے

تیرے باجھوں چیتر چڑھیا
نہ کوئی رنگ دی بکل ماری
نہ میں وٹنا ملیاں
تیرے باجھوں چیتر چڑھیا

تیرے مکھ دی پوہ نہ پھٹی
ہجر دا کجلا سڑیا
تیرے باجھوں چیتر چڑھیا

نہ میں لس دی تسبی پھیری
اکھیں دیوا بلیا
تیرے باجھوں چیتر چڑھیا

تیرا سر دھریا نہ ہک تے
چھاتی نگھ نہ بھریا
تیرے باجھوں چیتر چڑھیا

پکھواں وانگ اُڈاری بھرنا چاہنی آں
اپنی تلی تے دنیا دھرنا چاہی آں
میں تے ہر درروازہ دھی لئی کھولاں گی
میں اودی تقدیر بدلنا چاہنی آں
مینوں کوئی موڑھا رون نوں نہیں چیہدا
آپے ڈگ کے آپ سنبھلنا چاہنی آں
توں کیوں ایویں مینوں ڈراوے دینا ایں
میں تے رب نال یاری کرنا چاہنی آں
تیری ایس تصویر چہ چتر کارا میں
اپنی مرضی دے رنگ بھرنا چاہنی آں

ایسی خاک نوں چندن ہون دے
کدی رانجھن انگ تے لا
میرے ساہواں صندل گھول دے
میری اکھیں سرمہ پا
جد مکھ دا تیج میں پی لیا
مینوں چڑھیا نت دا چاء
میری روح وچ ونجھلی بولدی
میرے شیشے وچ خدا

عطا محمد/ پاک پتن شریف

قربتیں ایسی، کبھی ہم کو جدا ہونا نہ تھا
اس طرح ٹوٹے مراسم کہ کوئی رشتہ نہ تھا

دوستوں کی بے رُخی بھی دن بہ دن بڑھنے لگی
غیر تو پھر غیر تھے ان سے کوئی شکوہ نہ تھا

طے ہوا تھا خوش رہیں گے یار دونوں ہجر میں
یوں شکستہ حال تو پھر سامنا بنتا نہ تھا

ہاتھ آئے گی نہ کچھ بھی رائیگانی کے سوا
وقت ایسے بیت جائے گا کبھی سوچا نہ تھا

اُردو کا DNA (آغازِ اُردو کے نظریات پر مغز ماریاں)

امجد محمود چشتی/میاں چنوں

اردو زبان کے وطن، خاندان اور پیدائش کی بابت جس قدر موشگافیاں ہوئیں، شاید ہی کسی اور زبان کے بارے میں کی گئیں ہوں۔ اردو زبان کہاں پیدا ہوئی اور ارتقاء کیسے ہوا اس کا حتمی و قطعی فیصلہ نہیں ہو پایا بلکہ عمومی تصور ہے کہ یہ ایک کھچڑی زبان ہے جو ہندی، عربی، فارسی، ترکی اور بہت سی علاقائی بولیوں کے الفاظ سے وجود میں آئی۔ کوئی زبان اور علاقہ نہ رہا جس سے اردو کے تعلقات استوار نہ کرائے گئے۔ بہت سے دانشوروں اور محققین نے اردو زبان کو کسی اور زبان اور خطے کی جائز یا ناجائز اولاد ثابت کر کے ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس کا تعلق زبانوں کے سب سے بڑے خاندان'' ہند آریائی خاندان'' سے ہے اور اس کی جنم بھومی برِصغیر ہے۔ ذیل میں چند ایسی ہی عرق ریزیوں کا بیان ہے جن میں اردو کے کوجانچا جاتا رہا۔

اردو، بنتِ پنجابی

اُردو کی اصل تک پہنچنے میں سب سے مقبول نظریئے کا تصور حافظ محمود شیرانی نے دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب'' پنجاب میں اردو'' میں اردو کا مولد پنجاب کو قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں'' اردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی و ملتانی کے قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے آخر میں الف آتا ہے اردو دونوں جمع اور تذکیر و تانیث کے طریقے ایک جیسے ہیں۔ جبکہ ساٹھ فیصد الفاظ بھی مشترک ہیں۔'' ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر جمیل جالبی ایسے نابغوں نے بھی حافظ شیرانی کے اس خیال کی تائید کی ہے۔ تاہم مولوی عبدالحق اس تصور سے مشتعل ہوئے اور مضحکہ اڑایا۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ اکبر کے دور سے پہلے پنجاب نام کا کوئی خطہ نہ تھا۔

اردو، دخترِ دکن

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف'' دکن میں اردو'' میں دعویٰ کر دیا کہ اردو زبان دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول، بول چال اور لین دین کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ ان کا مؤقف ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے تجارتی روابط دکن میں قدیم دور سے چلے آ رہے تھے۔ جب عرب قبیلے دکن میں آئے تو مقامی باشندوں سے تجارتی و سماجی بندھنوں کے نتیجے میں ایک نئی زبان معرض وجود میں آئی جو اردو کی ابتدائی صورت تھی۔ ان کے مطابق اردو کا اصل وطن صرف اور صرف دکن ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان اپنی کتاب'' تاریخِ زبان اردو'' میں بضد ہیں کہ اردو کا پنجابی سے علاقہ نہیں۔ موصوف دہلی کے نواح میں بولی جانے والی بولیوں ہریانی، برج، کھڑی بولی اور میواتی کو اردو کی نانیاں دادیاں گردانتے گئے۔ اب بھلا ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کی کسی زبان سے رشتہ داری کروانے میں پیچھے کیوں رہیں۔ اس ضمن میں'' اردو زبان کا ارتقاء'' میں وہ اردو کو'' اُپ بھرنش'' زبان سے ماخوذ کر کے سرخرو ٹھہرے۔

برج بھاشا بطور خالائے اردو

اُردو عناصرِ خمسائی رکن محمد حسین آزاد کہتے ہیں کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ برج بھاشا سے اردو تک کے سفر میں وہ شاہجہان کے کردار کے بھی قائل ہیں۔ گویا ان کے دعوؤں سے لگتا ہے کہ برج، اردو کی ماں نہیں تو خالہ ضرور ہے۔

مرہٹی، اردو کی سگی بہن

ادب کے اک اور صاحب تحقیق ڈاکٹر سہیل بخاری نے ان تمام نظریات کو رد کر کے مہاراشٹر کی ''پراکرت'' زبان کو اردو کا ماخذ قرار دیا اور اردو کی تحقیق میں اپنا نام اس بہانے لکھوایا۔ اسے مرہٹی (مراٹھا) زبان بھی کہتے ہیں۔ پراکرت اصل میں سنسکرت کی بازاری زبان ہے۔ سنس بمعنی خالص گویا سنسکرت ادبی زبان تھی۔ ان کے الفاظ میں اردو، مرہٹی کی سگی بہن ہے۔ ساتھ ساتھ یہ عقدہ بھی کھولا کہ اردو ویدوں سے بھی قدیم زبان ہے۔ اور یہ کہ رگ وید میں اردو الفاظ کی موجودگی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دراوڑی زبان، اردو کی سیکنڈ کزن

ڈاکٹر سلیم اختر عین الحق فرید کوٹی سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب آریا ہندوستان آئے تو ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مہذب لوگوں سے پالا پڑا جو دراوڑی زبان بولتے تھے۔ انہوں نے نووارد آریاؤں کی زبان کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ یہی دراوڑی زبان اردو کی بھی اساس بنی اور اسی پر قصرِ اردو استوار ہوا۔

اُردو، بیسیوں ماؤں کی اکلوتی بیٹی

میر امن دہلوی نے کافی مصلحت آمیز خیال دیا۔ '' اکبر کے دور میں چاروں طرف سے اقوام قدردانی اور فیض رسانی کی سن کر جمع ہوئیں مگر ہر ایک کی گویائی اور بولی الگ تھی۔ اکٹھا ہونے اور آپس میں لین دین، سودا سلف اور سوال و جواب کیلئے اردو زبان

مقرر ہوئی''

رام بابو سکسینہ بھی قدرے اختلاف کے ساتھ امن دہلوی سے اتفاق کرتے تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی لگ بھگ یہی سمجھتے تھے کہ جب دہلی آباد ہوا تو ذی علم و قابل لوگ جمع ہوئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی، محاورے میں فرق آنے لگا اور اردو کی ترقی ہوئی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سے الفاظ اردو کے اپنے اور کون سے گھس بیٹھیے ہیں۔ ہماری سادگی ہے کہ عربی و فارسی اصطلاحات کو مقامی اردو سمجھتے ہیں۔ گویا جو حملہ آور جتنا پرانا ہوتا جائے اتنا ہی ''اپنا'' ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن امیر خسرو لائقِ تحسین و آفرین ہیں کہ ان کی زبان میں عربی الفاظ نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہی خالص مقامی اردو تھی۔ اردو دنیا کی ایسی عجیب اور با قاعدہ غریب زبان ہے جو ہمیشہ غلط فہمیوں میں گھری رہی۔ اپنے بیگانے شک کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ بیچاری کی شکل وصورت ہر دور میں بہت سوں کو دھوکہ دیتی رہی۔ اس کے آغاز و ارتقاء کی نسبت بڑے بڑے ادیب، محقق اور دانشور بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے اور اب تک بھٹک رہے ہیں۔ اگر کبھی اردو کے اصل کا سراغ لگنے کی راہ نظر آتی تو ''نقوشِ سلیمانیہ'' اور دتا تریہ کیفی کی ''کیفیہ'' ایسی تصانیف مخمصے اور تذبذب میں ڈالتی رہیں۔ اردو کی ابتداء اور نوعیت کی بابت جتنا کھوجتے جائیں اتنے ہی نئے انکشافات منصۂ شہود پہ آتے جائیں گے۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں۔ کسے یاد رکھیں کسے بھول جائیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ اردو نے ہر زبان سے الفاظ مستعار لئے اور اپنے کر لئے۔ جواباً ان زبانوں کے مورثین نے اردو پر اپنے اپنے مزاجوں کے رنگ چڑھائے۔ اس بات کی وضاحت معین نقوی کی اس نظم سے کی جا سکتی ہے، ملاحظہ ہو

اردو کو فارسی نے شرابی بنا دیا
عربی نے اس کو خاص ثرابی بنا دیا
اہلِ زباں نے اس کو بنایا بہت ثقیل
پنجابیوں نے اس کو گلابی بنا دیا
دہلی کا اس کے ساتھ ہے ٹکسال کا سلوک
اور لکھنؤ نے اس کو نوابی بنا دیا
بخشی ہے کچھ کرختگی اس کو پٹھان نے
اس حُسنِ بھوربن کو صوابی بنا دیا
باتوں میں اس کی ترکی بہ ترکی رکھے جواب
یوں ترکیوں نے اس کو جوابی بنا دیا
قسمت کی بات آئی جو تورانیوں کے ہاں
سب کی نظر میں اس کو خرابی بنا دیا
حروفِ تہجی ساری زبانوں کی ڈال کے
اردو کو سب زبانوں کی چابی بنا دیا
ہم اور ارتقاء اسے دیتے بھی کیا معین
اتنا بہت ہے اس کو نصابی بنا دیا

اردو اور پشتو: اردو اور دیگر زبانوں کے مباحث میں دیکھیں تو پشتو زبان اور پشتو بولنے والوں کی قناعت، بے نیازی اور حوصلے کو سلام کرنا پڑے گا کہ جب خطے کی تمام زبانیں اردو سے رشتہ داریاں جتانے پہ بضد ہیں تو پشتو والوں نے ایسے دعوؤں کا (دیگر معاملات حیات کی طرح) سوچا تک نہیں۔ اس طرح اردو کے طلبا اور محققین اک مزید زبان کے مطالعہ اور تحقیق کی اذیت سے محفوظ رہے۔

کارِ ثواب

عاصم بخاری/میانوالی

پل پر بہت رش تھا۔ سو مجھے بھی کچھ دیر گاڑی روکنا پڑی۔ مجھے کالج پہنچنے کی جلدی تھی مگر۔۔۔۔ مجھے خدشہ تھا کہ پل پر رش ہوگا مگر مجبوری یہ تھی کہ کالج جانے کا وہی ایک راستہ جس میں ایک پل پڑتا تھا۔

اب کیا ہو سکتا تھا۔ انتظار کرتے ہوئے اچانک میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو مچھلیوں کی خوراک دریا میں پھینک رہا تھا اور پرندوں کے لیے باجرے کے دانے خوراک کے طور پر بکھیر رہا تھا میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ مجھے اس کا یہ عمل اچھا لگا۔ وہ بھی مجھے ایسا کرتے ہوئے بڑا مطمئن نظر آیا۔ میں نے وہاں کھڑے لوگوں سے اس کے بارے پوچھا کہ یہ کون ہے تو ایک بچے نے بتایا کہ اس کا نام "مہربان" ہے۔ میں نے دل ہی دل میں بچے کی تائید کی کہ وہ واقعی مہربان ہے۔ بچے نے بڑے معصومانہ انداز میں بتایا ہم اس کو بچپن سے ایسا کرتا دیکھ رہے ہیں۔

"یقیناً" اس نے کسی سے سنا ہوگا کہ خدا کی بے زبان مخلوق کا خیال رکھنا کارِ ثواب ہے۔"

اسی لمحے ایک موٹر سائیکل والا شخص موٹر سائیکل کو گھسیٹتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔ اس کے ساتھ بیوی بھی تھی جس نے ایک چھوٹا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ گرمی کے دن تھے اوپر سے پیدل سفر۔۔۔ وہ خاصی تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھی۔۔ شاید پٹرول ختم ہو جانے کی وجہ سے کافی دیر سے وہ لوگ پیدل چل کر آ رہے تھے۔ موٹر سائیکل والا بھی موٹر سائیکل کھینچ کھینچ کر زچ ہو چکا تھا مگر وہاں پٹرول پمپ ہوتا تو وہ بھی پٹرول دلواتا۔۔۔ اچانک میں نے اس کو مہربان کے پاس رکتے ہوئے دیکھا۔ مہربان کی موٹر سائیکل ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اس کی بائیک کے ساتھ پیٹرول سے بھری بوتل لٹکی دیکھ کر اس نے سوال کیا

''بھائی جان یہ سو روپے لے لیں اور مجھے تھوڑا پیٹرول دے دیں تا کہ میں پیٹرول پمپ تک پہنچ جاؤں''

بھائی پٹرول پمپ یہاں کہاں؟ میں پانچ کلومیٹر آگے سے لے آیا ہوں۔ میرا موٹر سائیکل بھی رک گیا تھا۔ کسی سے لفٹ لے کر خرید لایا ہوں۔۔۔"

وہ مایوسی سے سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا اور میں سوچتا رہ گیا کہ کسی انسان کی مدد کرنا کیا ثواب کا کام نہیں ہے۔

''نمک زار'' ایک جائزہ

پروفیسر اطہر شاہ ٹکور یوسفزے

''نمک زار'' نومبر 2021 میں نستعلیق مطبوعات کے زیر اہتمام حاجی منیر پرنٹرز لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ پروفیسر نور کمال شاہ کے شگفتہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ انتساب مایہ ناز بین الاقوامی شہرت یافتہ مزاح نگاروں پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی کے نام ہے۔ دیباچہ موصوف نے خود لکھا ہے۔ دلکش سرورق اور دیدہ زیب کاغذ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ نستعلیق مطبوعات نے کتاب کی اشاعت میں اپنی فنکارانہ ہنرمندی بھی خوب دکھائی ہے۔ فلیپ پر مایہ ناز شاعر، ادیب اور سائبان تحریک کے روح رواں حسین مجروح نے اپنی ناقدانہ رائے لکھی ہے۔

نمک زار میں سترہ انشائیے شامل ہیں۔ یہ سترہ انشائیے سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں کے مترادف ہیں۔ فرانس میں مونٹین اور انگلستان میں فرانس بیکن نے انشائیے لکھے ہیں۔ اردو زبان میں ڈاکٹر وزیر آغا اور مشکور حسین یاد نے انگریزی ادب کے زیر اثر انشائیے لکھ کر دوسرے انشائیہ نگاروں کے لئے راستہ ہموار کیا۔ نور کمال شاہ کے انشائیے ''نمک زار'' اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ اردو میں اس کے لئے انشائیہ، انگریزی میں ''Essay'' فرانسیسی میں ''Essai'' عربی میں ''السعی'' اور پشتو ادب میں ''اولسی ادبی جرگہ'' کے جنرل سیکریٹری دوست محمد خان کامل مومند کا 1950 کا وضع کردہ نام ''نکل'' مشہور و معروف ہیں۔ اس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی بلکہ Essay Type لکھا جاتا ہے۔ موضوع کے متعلق لکھاری اپنی ذات، تجربے اور انفرادی تاثرات اس طرح پیش کرتا ہے کہ موضوع یا شخصیت کے پنہاں پہلو قاری کے سامنے آشکار ہوں۔ تاکہ موضوع کی بجائے وہ انشائیہ نگار میں دلچسپی لیں۔ موضوع سے گریز اگرچہ شرط نہیں ہے لیکن صاحب گریز کو اجازت ہے کہ واپس اپنے موضوع کی طرف لوٹ آئیں۔ پروفیسر صاحب نے ہلکے پھلکے مضامین یعنی انشائیے لکھے ہیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے زندگی کے تلخ تجربات و مشاہدات کو یکجا کر کے طنز و مزاح کے مسکراہٹوں سے ایسے کیپسول تیار کئے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی بندہ نگل ہی لیتا ہے۔ ''خدا تجھے کسی مہماں سے آشنا کردے''، " کھانسی اور کرونا'' "یاری خان"، "یہ عالم خوف کا"، "شریکہ حیات"، " ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"، "جھوٹ جدید شکل میں"، " کس نام سے پکاروں"، "عجیب تر ہیں بہت آنکھ کے فسانے بھی"، "باکمال لوگ"، "نصیبن خالہ"، "اب کہاں کی معتبر ہے شاعری"، "ہم کہاں کے دانا تھے"، "لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہو گئے'' اور "ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا"۔ مزکورہ شہ سرخیوں میں طنز کے نشتر اور مزاح کی مرہم پٹیاں رکھ دی ہیں۔ طنز اسی طرح کہ گویا کوئی سرجن اپریشن کر رہا ہو اور مزاح ایسا کہ کوئی فزیشن ٹیبلٹس (گولیاں) لکھ کر دے رہا ہو۔ غم اور خوشی کے ردعمل میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہو طنز و مزاح کہلاتا ہے۔ انشائیہ نگار کے ہاں بیگم صاحبہ کے قریبی رشتہ دار مہمان بن کر اپنے کیڑے مکوڑوں کے ساتھ پانچ دنوں کے لئے ایسے وارد ہوتے ہیں کہ کیاریوں سے پھول توڑنا، لائبریری سے کتابیں نکالنا، افسانے کے کاغذوں سے جہاز بنانا، گھر کے شیشے توڑنا اور چھٹے روز بوقت رخصتی چھوٹے کا بائسیکل لے جانا ایسا ٹھہرا کہ میزبان بندہ عاجز کو انشائیہ لکھنا پڑا کہ ''خدا تجھے کسی مہماں سے آشنا کردے"۔

یاری خان نامی انشائیے میں لکھا کہ یاور علی خان کو یاری خان، گل محمد کو گلے، بخت زاہد کو بختے، نواز خان کو نوازے، نعمان علی کو نعمانے، کریم خان کو کریمے خیبر پختونخواہ میں اچھے بھلے ناموں کا ستیا ناس کر دیتے ہیں۔ کھانسی اور کرونا میں جب سسرال جاتے ہیں تو جاتے ہی اپنی ساس خالہ سے لپٹ پڑتے ہیں۔ انہوں نے چوما، گلے لگایا اور بلائیں لینے لگیں۔ باہر آنے پر پتہ چلتا ہے کہ محترمہ کئی دنوں سے کرونا میں مبتلا ہیں۔ گھر کی دوسری خواتین پکار اٹھیں کہ ہم اشارتاً'' آپ کو روک رہے تھے مگر آپ کہاں کے رکنے والے تھے۔ وہ دل میں کہتا ہے کہ میں ان کو کیسے بتاتا کہ میں تو خود اپنا ملبہ گرانے وہاں گیا تھا الٹا وہاں کا عارضہ اٹھا لایا۔ "باکمال لوگ'' میں دوسروں کے ساتھ ساتھ محکمہ تعلیم پر طنز کے تیر برسائے ہیں کہ کمزوریاں کیا پہلے سے کم تھیں کہ رہی سہی کسر محکمہ تعلیم نے پوری کر دی۔ تعلیمی ادارے نامعلوم مدت کے لئے بند کر دیئے گئے۔ آن لائن امتحانات سے طالب علموں کی عادتیں بگاڑ ڈالیں۔ ''خوشامد کے معجزے'' میں لکھتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کو میرے دوست یاری خان زہر لگتے ہیں مگر یہی یاری خان جب بیٹھک سے بآواز بلند پکار اٹھے کہ ''یار! برا نہ منانا مگر جب تک بھابی کے ہاتھ کی چائے نہ پی لوں کسی چیز کا مزہ نہیں ملتا۔ خدا جانے اللہ تعالیٰ نے بھابی کے ہاتھ میں کتنی مٹھاس رکھی ہے۔ جو ذائقہ بھابی کے ہاتھ میں اللہ نے رکھا ہے وہ اور کسی شے میں بھلا کہاں۔ حیران ہوں کہ ایسی سگھڑ اور سمجھدار خاتون تم جیسے نالائق انسان کی قسمت میں کیونکر لکھ دی گئی ہے۔ چند ہی ثانیوں میں ڈرائنگ روم میں ایسی شاندار چائے سارے لوازمات کے ساتھ پہنچ چکی تھی اور چائے بھی ایسی کہ جس کے

لئے شوہر نامدار خود ترستے رہے ہیں۔

انشائیہ نگار کے سارے مضامین (انشائیے) اوران کے اندر طنز و مزاح کی ہلکی پھلکی نمک پاشیاں بلکہ گل پاشیاں چار چاند لگنے کے مترادف ہیں۔ آپ کے برمحل ضرب الامثال ومحاورات، لفظیاتی تراکیب، اخلاقی اقدار، ساختیاتی واسلوبیاتی انداز، منظر نگاری، صرفی ونحوی قواعد، صوتی آہنگ، جزیات نگاری، روزمرہ اور محاورے پر مضبوط گرفت اپنی مثال آپ ہیں۔ تعجب اور مزے کی بات یہ ہے کہ صاحب کتاب انشائیہ نگار حد سے زیادہ شرمیلے ہیں اور شرمیلے بھی ایسے جیسے نو بیاہی سہاگ رات والی دلہن۔ کتاب پر تصویر تک لگانے نہیں دیتے۔ پتہ نہیں موصوف کیوں گمنامی اور پس منظر میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میرا نام لینا ہے اور نہ ہی میری کتاب ''نمک زار'' کا۔ میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ بڑے بڑے انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا اور مشتاق احمد یوسفی تو شہرت اور مقبولیت کے بلندیوں پر ہیں۔ جواب دیتے ہیں، نہیں! مجھے شہرت کے آسمانوں میں نہیں رہنا۔ اگر اس مٹی کے باسی مجھے اس خاک خارزار پر سکون سے رہنے دیں تو غنیمت ہے۔

محترم حسین مجروح، حسن عباسی، ڈاکٹر عادل سعید قریشی اور ناصر علی سید جیسے ناقدین نے انشائیہ نگار کو داد و تحسین سے نوازا ہے۔ میں ناتواں بندہ ان کی فنی کمزوریوں پر کیونکر نکتہ چینی کروں۔

پروفیسر نور کمال شاہ واقعی کمال کے انشائیہ نگار ہیں، شاباش اور پذیرائی کے مستحق ہیں۔ آپ کی فنکاری، شگفتگی، نرالا انداز، دور رس تجربہ، عمیق مشاہدہ، طنز و مزاح کے رنگ برنگے مصورانہ تفکرات، تخئیل آفرینی، بات سے بات، مکھن سے مکھی اور مکھی سے مکھن نکالنا کوئی انشائیہ نگار موصوف سے سیکھے۔

کیا پوچھتے ہو حال میرے کاروبار کا
آئینے بیچتا ہوں میں اندھوں کے شہر میں

جوکر

تحریر: بینش احمد/اٹک

''آہ ہ ہ ہ ہ----!

میرا فون----!

حنا زمین پر بیٹھی اپنا ٹوٹا فون ہاتھ میں پکڑے زور سے چلائی تھی۔

کیا ہو گیا حنا؟ کیوں چیخ رہی ہو۔ چپ کرو۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اٹھو کھڑی ہو۔ حمزہ نے اُس کو زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ایسے کیسے چپ ہو جاؤں میں۔ دیکھ نہیں رہے تم۔ اِس جوکر نے میرا سارا فون توڑ دیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو بابا نے مجھے لے کر دیا تھا۔ میرا نیا فون اُففففففففف----!'' حنا شدید غصے کی حالت میں چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

جوکر کے کپڑوں میں ملبوس آدمی اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ وقت گویائی سے محروم ہو۔

''دماغ خراب ہے کیا تمہارا۔ اندھے ہو نظر نہیں آتا۔ میرا نیا فون توڑ دیا۔ اب کون اس کے پیسے بھرے گا۔ تمہاری تو اتنی اوقات ہے نہیں۔ جوکر بن کے لوگوں کو ہنسا کر ایک وقت کا کھانا کھاتے ہو گے تم۔'' حنا نے سخت حقارت بھرے لہجے میں اُس جوکر کے حلیے والے آدمی سے کہا۔

اِس قدر نفرت بھری باتیں سُن کر اُس جوکر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کے چہرے کے ماسک نے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔ وہ آدمی مسلسل اُس کے آگے ہاتھ جوڑے جا رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں انکل! آپ جائیں۔'' حمزہ نے اُس آدمی سے کہا۔

ایسے کیسے جائے علی۔ میرا نقصان پورا کیے بنا میں نہیں جانے دوں گی۔''

''حناء! کچھ خدا کا خوف کرو تم۔ دیکھ نہیں رہی اُن بزرگ کی حالت۔ میں کروا دیتا ہوں تمہارا فون ٹھیک۔ چلو اب یہاں سے۔'' حمزہ حنا کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولا

حمزہ گاڑی نکال رہا تھا کہ ایک دم سے وہ جوکر کے حلیے والا آدمی گاڑی سے ٹکرا گیا۔

اووونوووووو----! حمزہ سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخ کر بولا۔

''اُفف میرے خدا! اِس بڈھے کو مرنے کے لیے بھی ہماری ہی گاڑی ملی تھی۔'' حناء انتہائی غصے سے کہنے لگی۔

حمزہ فوراً گاڑی سے نکلا اور اس آدمی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔

''حمزہ یہ---- یہ تم کیا کر رہے ہو۔ اب ہم ہر کسی کو ہسپتال پہنچاتے پھریں گے۔ حنا انتہائی بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ بولی۔

کچھ تو عقل کرو تم۔ کیا ہم انہیں یوں سڑک پر مرنے کے لیے چھوڑ جاتے۔ تم اتنی بے حس کب سے بن گئی ہو حنا؟ ''حمزہ گاڑی کی سپیڈ تیز کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ قریبی ہسپتال پہنچ گئے۔ حنا بڑی بے دلی کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر ہسپتال تک آئی تھی۔ مریض کو ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا تھا۔ کیونکہ اُس کا خون بہت بہہ چکا تھا۔

اچانک ایک ڈاکٹر باہر آیا ''مریض کی حالت بہت نازک ہے۔ اُن کا خون بہت ضائع ہو گیا ہے۔ مریض کے پاس سے یہ تصویر اور نمبر ملا ہے۔ آپ برائے مہربانی ان کے گھر فون کر کے اطلاع دے دیجئے۔'' ڈاکٹر صاحب نے تصویر علی کے ہاتھ میں تھمائی۔

''حناء ---- ! یہ تو تمہاری تصویر ہے۔ اور اِس کے پیچھے نمبر بھی تمہارا ہی ہے۔'' علی حنا کو تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔

حنا حیران ہوتے ہوئے تصویر دیکھنے لگی'' آؤ ذرا چل کر دیکھتے ہیں۔ یہ کون ہے جس کے پاس میری تصویر ہے۔'' حنا ایمرجنسی وارڈ کی طرف جانے لگی۔

وہ لوگ ایمرجنسی وارڈ کے دروازے تک پہنچے تو شیشے کے اُس پار ڈاکٹرز اُس آدمی کے چہرے پر چادر دے رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر باہر آیا اور کہنے لگا: ''معذرت ہم آپ کے مریض کو نہیں بچا سکے۔ وہ جانے کتنے عرصے سے کینسر جیسے موذی مرض سے لڑ رہے تھے۔ اور اب تو وہ آخری اسٹیج پر تھے۔'' ڈاکٹر صاحب کیا ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں؟ حمزہ نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

جی آپ جا سکتے ہیں۔ دونوں آہستہ آہستہ اُس آدمی کے اسٹریچر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حنا نے قریب پہنچ کر اُس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ وہ ایک دم اُچھل کر دور جا گری تھی۔ جیسے اُس کو بجلی کا ایک زوردار جھٹکا لگا ہو۔

''بابا----! ایک زوردار چیخ کے ساتھ اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

بقیہ انٹرویو: مشتاق صوفی

نامور شاعر، مقبول ادیب، صحافی، محقق، مترجم، براڈ کاسٹر اور پنجابی زبان کے فروغ کے لئے متحرک مشتاق صوفی کے ساتھ مکالمہ

معاصرانہ پنجابی ادبی زبان کی تاریخ ہزار سال پرانی ہے:۔ مشتاق صوفی

جو تحریر ترجمے کے بعد کھڑی نہیں ہوسکتی اس میں کوئی بنیادی کمی ہے

پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ آبادی میں تیزی سے ہوتا ہوشربا اضافہ ہے۔ عامر بن علیؔ کے ساتھ خصوصی گفتگو

گورنمنٹ کالج کی سب سے خوبصورت بات حریت فکر کی روایت اور سوچنے کی آزادی، مکالمے کی حوصلہ افزائی تھی۔ یہ بات ساہیوال میں نہیں تھی اور آپ کے میاں چنوں میں بھی شاید نہیں ہوگی۔ اختلاف رائے کی برداشت نے مجھے جی سی میں بہت متاثر کیا۔

ارژنگ: آپ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو میڈیا سے تعلق بھی ہے۔ میڈیا کی جانب کیسے آئے؟

مشتاق صوفی: گورنمنٹ کالج لاہور کے اکثر طلباء کا شوق تو سول سروس میں جانے کا ہوتا ہے۔ اکثر جی سی والوں کو طاقتور بابو بننے کی جانب مائل دیکھا۔ مگر زمانہ طالب علمی میں ہی ہمارے دوست لکھنے پڑھنے والے لوگ بن گئے۔ بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے دانشور اور شاعر حلقۂ احباب میں آنے کا یہ اثر ہوا کہ ہم نے فیصلہ کیا کہ سول سروس کی طرف نہیں جانا ہے۔ ان دنوں پی ٹی وی بہت بڑا ادارہ تھا۔ یہ واحد ٹیلی ویژن چینل ہوا کرتا تھا پورے ملک کے اندر۔ تمام بڑے مصنفین، گلوکار، موسیقار اور بڑے بڑے فنکار اس سے وابستہ تھے۔ ان دنوں پی ٹی وی نے پہلی مرتبہ پروگرام پروڈیوسر براہ راست بھرتی کرنے کا اعلان کیا۔ میں بھی بغیر کسی سفارش کے چلا گیا۔ اسلم اظہر نے انٹرویو کیا۔ بڑے شاندار، روشن خیال اور سخن فہم آدمی تھے۔ حالانکہ میری کوئی سفارش بھی نہیں تھی پھر بھی منتخب ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ باقی لوگ بھی بغیر سفارش کے ہی بھرتی ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بغیر سفارش کے بھی لوگ بھرتی ہوجایا کرتے تھے۔ وجہ یہ بھی تھی کہ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد گھر والوں سے پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔

ارژنگ: پنجابی زبان وادب کی طرف رجحان کب اور کیسے ہوا؟

مشتاق صوفی: جن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرتعلیم تھا تو میرا قیام نیو ہوسٹل میں تھا۔ معروف لکھاری اجمل نیازی بھی ان دنوں نیو ہوسٹل میں ہی رہتے تھے۔ مجھ سے سینئر تھے اور کورس مکمل کرکے جا رہے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ تم پنجابی کونسل کے سیکرٹری کیوں نہیں بن جاتے؟ میں نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کردی۔ چونکہ عمر کے اس حصے میں آدمی اپنی اہمیت بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ لہٰذا میں نے آمادگی اور شوق ظاہر کیا تو انہوں نے کالج انتظامیہ اور پنجابی سوسائٹی کے انچارج سے بات کی۔ عام طور پر تو ماسٹرز کے طالب علم کو جنرل سیکرٹری رکھتے ہیں لیکن مجھ سے ملاقات کے بعد انہوں نے میرے ادبی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے منتخب کرلیا۔ افتتاحی سیشن کے لئے انہوں نے میرے ذمے لگایا کہ معروف پنجابی شاعر نجم حسین سید کو مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی دعوت دیں۔ وہ ان دنوں اے جی آفس میں ایک بڑے سرکاری افسر تھے۔ میں ملنے کے لئے گیا تو دربان کے ہاتھوں اپنا تعارفی رقعہ بھیجا۔ نجم حسین سید صاحب نے مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا اور گورنمنٹ کالج ہماری دعوت پر آنے کی آمادگی بھی ظاہر کردی۔ مجھے بہت اچھا لگا پھر جب وہ تشریف لائے تو ان سے بہت ساری شاعری بھی سنی۔ بہت پسند آئی چونکہ پنجابی اور شاعری بے شک میرا شعبہ نہیں تھا مگر دیہاتی ہونے کے ناطے زبان پر مجھے اچھی شدبدھ حاصل تھی۔ ایک لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اجمل نیازی میرے پنجابی شعر وسخن اور زبان کی جانب راغب ہونے کا بنیادی محرک ہے۔ یہ وہی ایام تھے جب میں نے پنجابی شاعری کا آغاز کیا تھا۔

ارژنگ: آپ کی پہلی کتاب نثر کی تھی یا شاعری کی؟

مشتاق صوفی: شاعری کی کتاب پہلے شائع ہوئی تھی۔ نثر کی جانب بعد میں آیا۔

ارژنگ: کس زبان میں تھی یہ پہلی کتاب؟

مشتاق صوفی: پنجابی زبان میں ہی شاعری کرتا ہوں۔ اردو میں صرف ایک ہی نظم آج تک لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی پنجابی زبان میں ہی تھی۔

ارژنگ: آپ کو روشن خیال اور ترقی پسند مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ برصغیر میں ترقی پسند تحریک کا ادب کی ترویج میں کیا حصہ ہے؟

مشتاق صوفی: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو معروف معنوں میں ترقی پسند ادیب نہیں سمجھتا ہوں۔ ترقی پسند تو ہر ادیب ہوتا ہے مگر میں آرتھوڈوکس بائیں بازو کا کارکن نہیں ہوں۔ خود کو ترقی پسند کی بجائے عوام دوست کہلوانا پسند کرتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ میرے خیال میں جو ادیب انسان دوست نہیں وہ اچھا ادب تخلیق ہی نہیں کرسکتا۔ ہماری جوانی کے دنوں میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے لکھاریوں میں تقسیم بڑی واضح تھی۔ پھر بائیں بازو میں بھی ماسکو نواز اور چین نواز

دھڑے تھے۔ میرا دونوں کے ساتھ تعلق تھا مگر میں مکمل طور پر کسی گروہ کا بھی حصہ نہیں تھا۔

ارژنگ: پنجابی زبان کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

مشتاق صوفی: معاصرانہ پنجابی زبان کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔ ہمارے ملک کی اور کوئی بھی زبان اتنی قدیم نہیں ہے۔ اس وقت کی پنجابی سندھی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ پہلی ادبی دستاویز ہمیں جو پنجابی زبان میں ملتی ہے وہ گیارہویں صدی عیسوی کی ہے۔ آج سے ایک ہزار سال قبل جب ملتان میں اسماعیلی مسلک کی حکومت تھی تو وہاں پر یہ مذہبی گیتوں کی کتاب ''گنان'' کے نام سے مرتب ہوئی۔ اس زبان پر عربی کے بھی اثرات تھے چونکہ سندھ پر عربوں کی حکومت تھی اور اسماعیلی حکمران بذات خود بھی عرب تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس وقت کی پنجابی پر فارسی کے اثرات بھی نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ لاہور کے گورنر کا ایک معتمد خاص تھا مسعود سعد سلمان، زیر عتاب آنے کے بعد اس نے حبسیات پر ایک دیوان لکھا قید کے دوران جو کہ فارسی میں لکھا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک ہندوی دیوان بھی تھا۔ اب مگر ناپید ہے۔ بارھویں صدی میں بابا فرید نے باقاعدہ شعری روایت کے خدوخال طے کیے۔ رنجیت سنگھ کے دور تک تو اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر انگریز نے پنجابی زبان کی بے توقیری کی تھی۔ امید ہے اتنی بڑی زبان مرے گی تو نہیں چونکہ سکھوں کی تو یہ مذہبی زبان بھی ہے۔

ارژنگ: آپ کا پسندیدہ شاعر اور مصنف؟

مشتاق صوفی: کس زبان میں؟

ارژنگ: پنجابی زبان سے اگر ابتداء کریں؟ عہد حاضر کے شعراء جو پسند ہوں؟

مشتاق صوفی: نجم حسین سید، امرتا پریتم، شوکمار بٹالوی، پاش، نسرین انجم بھٹی، زمرد ملک اور راجہ صادق اللہ مجھے زیادہ پسند ہیں۔

ارژنگ: اردو میں شاعری کے تین عہد بیان کیے جاتے ہیں، میر، غالب اور اقبال یا پھر فیض احمد فیض کا موجودہ عہد ہے۔ پنجابی زبان میں بھی کلاسیک ادب کو اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

مشتاق صوفی: پنجابی کلاسیکی ادب میں فنی اعتبار سے بڑے شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اردو کی طرح پنجابی میں ایسی تقسیم کرنا اس لئے شاید ممکن نہ ہو۔ آپ دیکھیں دامودر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ جس نے پہلی پہلی مرتبہ ہیر کا کردار تخلیق کیا اور پہلی ہیر لکھی۔ اسی کی پیروی میں وارث شاہ اور دیگر نے پھر پیروی کرتے ہوئے لکھا داستان گو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جس میں حافظ برخوردار، میاں محمد بخش۔ مترنم شاعری میں گرونانک، فرید، بلھے شاہ، علی حیدر، ہاشم شاہ، سلطان باہو، رزمیہ شاعری کی بات کریں تو اس بابت نجابت کی نادر شاہ دی وار اہم ہے۔ لہٰذا پنجابی میں کسی ایک شاعر کا نام لینا ماسوائے بابا فرید کے، جو کہ اس شعری روایت کے بانی ہیں، پورا عہد کسی ایک شاعر کے نام جوڑنا ممکن اور مناسب نہیں ہوگا۔ بڑے فن والے بہت شاعر ہیں۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

مشتاق صوفی: میری بارہ، تیرہ کتب اب تک شائع ہوچکی ہیں شاعری اور نثر دونوں ہی ان میں شامل ہیں۔ زیادہ تر پنجابی اور انگریزی میں ہیں۔ تنقید کے موضوع پر دو کتابیں اور انگریزی میں مزید دو کتابیں اس وقت زیر طبع ہیں۔ میں نے تراجم بھی کئے ہیں۔ ان میں میاں کمال دین کی کہانیوں کا ترجمہ آج کل انگریزی زبان میں زیر طبع ہے۔ بہت ہی خوبصورت داستان گو گزرے ہیں میاں کمال دین۔

ارژنگ: سوشل میڈیا کو ادب کے فروغ میں معاون سمجھتے ہیں؟

مشتاق صوفی: سوشل میڈیا کی رسائی تو بہت زیادہ ہے۔ اس کی رسائی سے تو انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر اس میں وہ سنجیدگی نظر نہیں آتی۔ کسی حد تک ہمارا سوشل میڈیا ہمارے سماج کی ہی جھلک دکھا رہا ہوتا ہے؛ جیسے ہم ہیں ویسا ہمارا سوشل میڈیا ہے، فیس بک کی نسبت ٹوئیٹر پر بہتر ذہنی استطاعت کے لوگ جمع ہوتے ہیں، مگر وہ زیادہ سیاسی فورم ہے۔

ارژنگ: پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ؟

مشتاق صوفی: آبادی میں بے پناہ اضافہ ہمارا مسئلہ نمبر ایک ہے۔ اتنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو نہ تو مناسب صحت کی سہولیات فراہم کرنا ممکن ہے اور نہ ہی معیاری زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی سہولیات کی فراہمی بھی اس قدر تیزی بڑھتی بے پناہ آبادی کو فراہم کرنا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ اس بابت ہمیں بنگلہ دیش سے رہنمائی لینی چاہیے کہ انہوں نے کیسے اپنی آبادی پر کنٹرول کیا ہے، اس کے بغیر ترقی کی راہ پر چلنا ممکن نہیں ہے۔

ارژنگ: آپ مترجم بھی ہیں، بحیثیت ادیب اور قاری آپ کی نظر میں تراجم کی کیا اہمیت ہے؟

مشتاق صوفی: جس طرح معیشت، سماج، ثقافت ہر شعبے میں زبانوں کے تراجم کی اہمیت بہت زیادہ ہے آج کل اسی طرح ادب میں بھی ترجمہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ انہی کے سبب ہی ہمیں دنیا بھر کے ادیبوں سے آشنائی وتعارف ہوتا ہے، تراجم کی بدولت ہی ہم غیر ملکی زبانوں کے ادب سے متعارف ہوتے ہیں۔ میری نظر میں جو تحریر ترجمے کے ذریعے کھڑی نہیں ہوسکتی اس میں کوئی بنیادی کمی ہے۔ ممکن ہے اس مقامی میں رنگ ہو یا پھر استعارے جو ترجمے کے بعد اپنا رنگ وحسن کھودیتے ہوں۔ مگر پھر بھی بڑی تحریر تو وہی کہلائے گی جو ترجمے کے بعد بھی کھڑی رہے۔ بائیں بازو کے نظریات کا آپ نے ذکر کیا ہے، اگر ناظم حکمت، پابلو نرودا ترجمے کے بعد بھی یہاں مقبول ہوسکتے ہیں تو پھر فیض احمد فیض کیوں ترجمہ ہونے کے باوجود بیرونی دنیا میں ویسی شہرت اور پذیرائی حاصل نہیں کرسکے؟ اس پر ہمیں سوچنا چاہیے۔ ہم اسے غیر ملکی قارئین کا قصور تو قرار نہیں دے سکتے، یقیناً کلام میں ہی کوئی کمی ہے۔

گالوے کنیل کی نظم ''موسموں'' کا ترجمہ

مترجم: اقصیٰ غرشین/کوئٹہ

گالوے کنیل، اپنے وقت کے مایہ ناز اور بیسویں صدی کے عکاس شاعر جانے جاتے ہیں۔ بہار کی نسبت سے انکی نظم، "موسموں' نے حیاتی تغیر اور فطری حسن جیسے موضوعات کی سبب شہرت پائی۔ اس نظم میں زندگی کی تیز رفتاری اور بے ثباتی استعارہ بنیں۔ موسم اور برف انسانی فطرت کی جانب اشارہ کرتے ہیں، کہ اب چاندی ایسے چمکتے ہیں، ٹھنڈک کا احساس دلاتے ہیں اور اب پگھلے چلے جاتے ہیں۔ یہ ۱۹۶۰ء کے شعری مجموعے، "What a Kingdom it was" آہ وہ کیا کشور تھی' میں شائع ہوئی۔ اصل متن تو کنیل کا ہی ہے، البتہ ترجمے کی جسارت بندہ ناچیز کی ہے۔

درخدمتِ شما

بہار کے ابریشمی غلاف سے
موسم گرما کے پتنگوں تک
گرمی کے ابریشمی غلاف سے
خزاں کی تتلیوں تک
خزاں کے ریشمی خول سے
سردیوں کے پروانوں تک
میں نے اپنی زیست کو، پتوں کی مثل بدوشِ ہوا دیکھا
اور وہ پتے، جنکے درخت جلد ہی نابود ہوئے جائیں گے

برف مسلسل لطافت سے گرتی ہے
اور ہوا ہے کہ، کبھی مشرق، کبھی جنوب، کبھی شمال
یہ ہوا ہے جو برف کو صدا و دوام بخشتی ہے
ایک پاک، اصیل اور عمیق صدا
کہ میری روح تک آپ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتی ہے

مگر پھر بھی، نجانے کیوں، میرا یہ تعجب
مجھے یہ احساس دلاتا ہے کہ سب عارضی ہے
یہ بس اس لمحے پگھلنے والی ہے
اپنے جمال کی یاداشتیں چھوڑ کر، پگھلنے والی ہے

زندگی کی بھی تو یہی ریت ہے
ہم بھی تو برفانی ریزوں کی مانند، اڑتے، بکھرتے
ایک لمحہ موجود، اور دوسرے لحظے مفقود
اور گر ہم بھی آب ہو جائیں
حسن ہمارا دائمی ہوگا
سوچوں کی بازگشت بنے گا، اپنے پیاروں کی یادوں کی
اور نقوش ہمارے جہاں پر ثابت ہوں گے

بدلتے موسموں کی طرح
ہم بھی تو گردشِ جہان سے گزرتے ہیں
ہر گردش پہلے سے جدا
ہر مدار قربت کا بہانہ

مگر جیسے بلند قد، متکبر درخت
جھڑتے پتوں سے شکست نہیں کھاتے
ہم بھی سہہ سکتے ہیں بدلاؤ
دل میں خوش اندامی، انداز میں رکھاؤ
اور ہر لحہ، قطرہ قطرہ وقت سراہیں

گو وقت ہے کوتاہ
اور زیست گزرگاہ
پر تاثیر تو چھوڑی جاسکتی ہے
کرموں سے، لفظوں سے، محبتوں سے

اور جب زمان ماتمام ہو
اور ازن ہوا ایک نئے سفر کا اس آگاہی سہارے سکوں تو ملے گا
جو گزری مقاصد سے عاری تو نہ تھی
بازگشت ہماری خالی تو نہ تھی
بدلتے ہوئے موسم جیسے
دلوں میں، تذکروں میں
چھوڑ جاتے ہیں چھاپ

اقصیٰ غرشین/کوئٹہ

ستائش گر

مجھے یاد ہے تمہیں عشق تھا موتیے کے پھول سے
تمہیں آندھیوں سے پیار تھا، مانوس تھے تم دھول سے
تم برق کے معشوق تھے
تم ستائش گر تھے رعد کے
زغال سے بنتے تھے تم خاکے عجب کمال کے
تمہیں فلسفے سے رغبت تھی، یہ شوق بے مثال تھا
تمہیں بلندیوں کی چاہ تھی، اونچائیوں کی طلب بھی تھی
دراز کوہ ساتھی بھی تھا، دراز کوہ عیال تھا
کیا ہم بھی تم بھی تھے آشنا
یا فقط یہ خواب و خیال تھا
کچھ ہم میں تم میں کوئی ربط تھا؟
یہ سوال ہے، یہ سوال تھا

شاعری

تھے عکس جتنے بھی اُس کے ، انہیں خزانہ کیا
یوں اپنے خانۂ دِل کو نگار خانہ کیا
وہ روشنی کے تسلسل کا قتل چاہتی تھی
دِیئے سے پہلے ہَوا نے مجھے نشانہ کیا
میں اُس کا سمت نُما تھا ، یہ وہ بھی مانتا تھا
پھر اُس نے دوسری جانب مجھے روانہ کیا
کِیا جو لمحۂ ہجراں میں اُس نے قید مجھے
''مَیں ایک پل تھا اور اُس نے مجھے زمانہ کیا''
مجھے یقین تھا خوشبو اِدھر ہی آئے گی
سومَیں نے دل کے دریچے کو بے ہَوا نہ کیا
وُہ جس کے ہجر سے دِل میں خزاں کا موسم تھا
اُسی کی یاد نے موسم بڑا سہانا کیا
مَیں جیتا جاگتا اِک آدمی کمال کا تھا!
مرورِ وقت نے لیکن مجھے فسانہ کیا
زیادہ فرق نہ دیکھا جو میں نے دونوں میں
قفس کو مَیں نے بصد شوق آشیانہ کیا
نکل گیا تھا جنوں میں جو کوئے جاناں سے
خبر نہیں ہے پھر اُس نے کہاں ٹھکانہ کِیا
وہ جانتا تھا مَیں لفظوں میں زندہ رہتا ہوں
سو اُس نے اپنے سخن کو ہی تازیانہ کیا
سفر نصیب تھا مَیں، اور سفر نصیب رہا
کِیا قیام جہاں بھی ، مسافرانہ کیا
کماں سنبھالنا میں نے جسے سکھایا تھا
اسی کے تیروں نے آخر مجھے نشانہ کیا
مَیں اُس کی تلخ کلامی پہ کچھ نہ بولا جب
تو اُس نے لہجے کو کچھ اَور عامیانہ کیا
یہ دل تھا عشق کا آتش کدہ نسیمِ سحر
سلوکِ سرد سے اُس نے جو سرد خانہ کیا

نسیمِ سحر/راولپنڈی

نکال کر وہ محبت کی فال حیرت سے
وہ مجھ کو دیکھ رہا تھا کمال حیرت سے
نکل گیا وہ کہیں کہکشاؤں سے آگے
شمارے تکتے رہے اس کی چال حیرت سے
یہ کس نے آ کے مناظر کو کر دیا رنگین
نظارے ڈال رہے ہیں دھمال حیرت سے
حسین ایسا کہ خود حسن کھو گیا اس میں
اسی کو تکتے تھے حسن و جمال حیرت سے
ازل ازل سے وہی نور بے مثال رہا
اسی کو تکتے تھے سب بے مثال حیرت سے
حسین اُنؐ سا نہ دیکھا تھا اس کی آنکھوں نے
جبھی تو دیکھ رہے تھے بلالؓ حیرت سے
تمہارا حسن کسی سوچ میں سماتا نہیں
تجھی کو دیکھتے ہیں سب خیال حیرت سے
جواب سارے مرے لاجواب ہو گئے تھے
وہ جب بنا تھا سراپا سوال حیرت سے
وہ آیا جانِ بہاراں کچھ ایسی دھج سے جلیلؔ
کہ اس کو تکتی تھی بادِ شمال حیرت سے

احمد جلیل/

مت یہ کہہ، ظلمت گئی ہے حرف کی حرمت گئی
جب منافق ہو گئے سب لوگ تو چاہت گئی
جتنے گل رُخ چہرے تھے بس یاد کچھ اُن کو اب
کیسی کیسی ہو کے ہم سے یاں جدا مورت گئی
جب جواں وہ ہو گئے تو ہو گئے زیرک بہت
بھولے پن میں ان کی وہ ''ہاں'' کہنے کی عادت گئی
کر گئے ادراک دنیا کا فقط اہلِ جنوں
اور خرد کے پاس خبروں کی فقط صورت گئی
پوچھ مت کیسے غریبوں نے گزارے رات دن
اہلِ دل سے دیکھنے کی اب تو یہ ہمت گئی
ہر دلِ حاکم سے تو احساس رُخصت ہو گیا
دن غریبوں کے بدلنے کی ہر اک صورت گئی
ہم نے جانا ہے تو اتنا جانا ہے مسعودؔ جی
ماں کے قدموں سے اُٹھے تو ہاتھ سے جنت گئی

خالد مسعود/لاہور

بے رنگ نہ تھا جہان پہلے
نیلا تھا یہ آسمان پہلے
وہ گلیاں تلاش کر رہا ہوں
میرا تھا جہاں مکان پہلے
اے ہجر! شروعِ عشق میں تو
جاتا ہی نہیں ہے دھیان پہلے
دنیا میں خدا کے بعد میرا
بس ایک تھا مہربان پہلے
اُس پر بھی لکیر بن رہی ہے
جو زخم تھا بے نشان پہلے
انداز الگ ہے چاہنے کا
ہوتا ہوں میں بدگمان پہلے
رہتا تھا ظہورؔ کتنا تنہا
میں اپنوں کے درمیان پہلے

ظہور چوہان/بہاولپور

بس ایک شکوہ وحشت رضا کے اندر بھی
بقا کا ورد چھپا ہے فنا کے اندر بھی
ذرا سا پاؤں دھرا اُس نے دل کی دھرتی پر
چراغ جلنے لگے تھے ہوا کے اندر بھی
یہ خوف تھا کہ پرندے ہی مر نہ جائیں کہیں
کہ حبس بڑھنے لگا تھا فضا کے اندر بھی
کسی نے روک لی ہاتھوں سے درد کی دیوار
وگرنہ شور بپا تھا خلا کے اندر بھی
کہاں کسی پہ کبھی منکشف ہوا کچھ بھی
بہت سے راز نہاں تھے دعا کے اندر بھی
یہ کیسی عرضیاں لکھ دی تھیں میرے اشکوں نے
یہ کس کی سسکیاں بکھریں صدا کے اندر بھی
نہ خوف مرگ نہ ہی زیست کی تمنا تھی
یہ زہر کس نے ملایا دوا کے اندر بھی
اسی لیے تو وہ چارہ گری پہ مائل ہے
کوئی ملال اُٹھا ہے خدا کے اندر بھی
بس ایک آس تھی ورنہ یہ زخم کاری تھا
قدم قدم تھے شکستہ وفا کے اندر بھی

آسناتھ کنول/لاہور

امجد اسلام امجد کے لیے ایک نظم

محبت پر حسیں نظموں کی خوشبو سے بھرا شاعر
یقین و بے یقینی کے کئی اشعار میں بارش کی آوازیں
پروتا تھا
سرائے شام میں اکثر پریشانی میں کہتا تھا
کہاں رکھوں گا اتنے خواب؟
ابھی حیرانیوں میں مسکراتا، گنگناتا تھا
یہیں کوئی کہیں نزدیک ہی
گر آسماں کا ساتواں در کھول دے تو پھر
فشار آلود لمحوں میں سحر آثار ہنستی بھیگتی
کوئی ہوا جب ساحلی آئی
تو دل سیراب بھی ہوگا
وہ کہتا تھا محبت ایسا دریا ہے
کہ جو اس میں اُتر جائے
اسے دنیا تو کیا برزخ سے بھی اس پار تک
مدہوش لہروں کے سہارے لے کے جاتا ہے
وہ آخر آج ہم سے دور
ہاں اس پار جا پہنچا

شہباز نیر/رحیم یار خان

دکھ تو یہ ہے زندگی کا خواب پورا رہ گیا
تُو مکمل ہو گئی اور میں ادھورا رہ گیا
مجھ کو بچپن سے ہی لوگوں کی سمجھ آنے لگی
سو کسی نے بات جو بھی کی میں زیر تہہ گیا
مجھ سا بدقسمت نہ کوئی ہوگا تیرے شہر میں
جو گھروندا خواب کا میں نے بنایا ڈھ گیا
اب مرے اندر خس و خاشاک تک باقی نہیں
اشک بن کر وہ مری آنکھوں سے اتنا بہہ گیا
سوچتا ہوں چُپ لگی شکلوں کی حالت دیکھ کر
بچ گیا وہ جس کے منہ میں جو بھی آئی کہہ گیا
اب مجھے وہ زخم دے جو موت کا باعث بنے
ورنہ تیرا ہجر تو میرا کلیجہ سہہ گیا

ازور شیرازی/مانسہرہ

دیکھ کر اس کا مکاں حیرانی میں
اس گلی سے گزرا میں جولانی میں
یہ ہماری رہ گزر ہر گز نہیں
ہم زمیں پر آگئے نادانی میں
ملتا جلتا تھا تری آنکھوں سے وہ
عکس تھا جو چاند کا اس پانی میں
دیکھ کر تصویر اس کی، آج میں
کھو گیا تھا عالمِ ویرانی میں
زندگی کا لطف ہیں دشواریاں
رکھا ہی کیا ہے بھلا آسانی میں
رات تھی اور آسماں خاموش تھا
ہم ملے تھے چاند کی نگرانی میں

مہر علی/ساہیوال

خاک ہونے سے اس کو بچایا گیا
راستے میں پڑا پھول اٹھایا گیا
ایک جیسا ہی منظر دکھایا گیا
شام میں صبح کا عکس لایا گیا
ایک ویرانی سی قید تھی آنکھوں میں
ایسی حالت میں بھی مسکرایا گیا
روشنی اور اندھیرے جدا تو نہیں
پردۂ شب میں ہی دن چھپایا گیا
ان گنت رنگ ایجاد کرنے پڑے
پھر خلا میں زمیں کو بنایا گیا

مہر علی/ساہیوال

یاقوت سے وہ ہونٹ رُخِ یار کی زینت
شہ سرخیٔ اخبار ہے اخبار کی زینت
تاریخ نے دہرایا تو پھر صاحبِ عالم
شہزادے کیے جائیں گے دیوار کی زینت
یہ عین جوانی میں گزرنے کی روایت
تکرار گھٹا دیتی ہے کردار کی زینت
اس شہر میں ہم اہلِ وفا ہوتے رہیں گے
زندان کی رونق تو کبھی دار کی زینت

فخر ولیم لالہ

انجم آرائی کے نجم "عامر بن علی"

اکمل حنیف/لاہور

25 دسمبر 2022، بروز اتوار نجم فیلوز کے زیرِ اہتمام ایک خوبصورت نجم آرائی کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب نجم فیلوز اسٹوڈیو (دی ہاؤس آف آرٹ اینڈ لٹریچر) پارک ویو لاہور میں منعقد ہوئی۔

آنے والے شعراء کرام کو نجمین میری مراد جناب جی اے نجم، جناب نبیل نجم نے خوش آمدید کہا۔

صاحبِ شام:

جاپان میں مقیم پاکستانی نژاد ہمہ جہت تخلیق کار اُردو زبان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، مترجم، سفرنامہ نگار، کالم نگار، ماہنامہ ارژنگ کے مدیرِ اعلیٰ اور پیکرِ محبت جناب عامر بن علی کے نام ایک خوبصورت شام سجائی گئی۔ محترم عامر بن علی آج کی شام کے مہمانِ خاص تھے

صدارت:

اس یادگار نجم آرائی کی صدارت اُردو و پنجابی زبان کے خوبصورت لب و لہجے کے صاحبِ اسلوب بین الاقوامی شہرت کے حامل سینئر شاعر، خاکِ محبت سے بنے نفیس انسان جناب نذیر قیصر نے فرمائی۔

نقابت کے فرائض جناب جی اے نجم (بانی و روحِ رواں نجم فیلوز) نے خوبصورتی سے سر انجام دیئے۔ تقریب کا آغاز جی اے نجم نے تلاوتِ قرآن پاک سے کیا۔

مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

جناب نذیر قیصر، جناب عامر بن علی، جناب ڈاکٹر غافر شہزاد، محترمہ نرگس نور، محترمہ ڈاکٹر پونم نورین، محترمہ ثانیہ شیخ، ثوبیہ خان نیازی، جناب خالد اعجاز مفتی، جناب شاکر خان بلوچ، جناب محمد آصف انصاری، جناب شہریار انصاری، جناب احمد علی کیف، جناب نبیل نجم، جناب جی اے نجم اور راقم (اکمل حنیف)

شعراء کرام اور سامعین نے ہر اچھے شعر پر خوب داد دی اور شعراء کرام کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

مشاعرہ کے اختتام پر نذیر قیصر اور محترمہ عابدہ قیصر کی خوشیوں میں اضافہ کرتے ہوئے کرسمس کا کیک کاٹا گیا۔

دی ہاؤس آف آرٹ اینڈ لٹریچر کی تزئین آرائش قابلِ ستائش ہے' جی اے نجم اپنے خوابوں کی تعبیر کی طرف رواں دواں ہے میں تمام نجم فیلوز بالخصوص جناب جی اے نجم کو ایسی کامیاب اور یادگار پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں

اور خود نجم فیلوز کا حصہ ہونے کے ناطے آنے والے تمام شعراء کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ اس خوبصورت نجم آرائی میں بطور نجمین شریک ہوئے۔

شعراء کرام اور سامعین کے لیے ہائی ٹی کا اہتمام کیا گیا، اور پھر شعراء کرام اور سامعین کو شکریہ اور عزت کے ساتھ الوداع کیا گیا۔

نعت رسول مقبول ﷺ

سانسیں ہوئیں بحال دیارِ حضور میں
دل سے مٹے ملال دیارِ حضور میں
کب ہو سکا بیان ندامت کے خوف سے
دل کا تمام حال دیارِ حضور میں
کچھ دن وہاں گزار کے ایسا لگا مجھے
گزرے ہیں ماہ و سال دیارِ حضور میں
اک فکر نعت ساتھ مرے دم بہ دم رہی
بھٹکا نہیں خیال دیارِ حضور میں
جذبوں کو چاشنی ملی کیف دوام کی
سوچیں ہوئیں نہال دیارِ حضور میں
کیا دلکشی بیان کروں ان فضاؤں کی
دیکھا عجب جمال دیارِ حضور میں

علی رضا/ساہیوال

نعت رسول مقبول ﷺ

گلی میں مدینے کی جانا ہوا ہے
سماں میرے دل کا سہانا ہوا ہے
کھڑے ہی رہے غار کے وہ قریں ہی
مگر بند اس کا دہانہ ہوا ہے
درودوں سلاموں کی محفل سجا کر
یہ مستانہ تب سے یگانہ ہوا ہے
اُٹھائی خدا نے قسم مصطفیؐ کی
تو والعصر ان کا زمانہ ہوا ہے
نگاہوں میں اب کچھ بھی جچتا نہیں ہے
مدینے میں جب سے ٹھکانہ ہوا ہے
دلوں سے جو نامِ محمدؐ مٹانا
یہ ممکن ناممکن فسانہ ہوا ہے
درِ مصطفیؐ سے سخن کا اے حالی
عطا خوب صورت خزانہ ہوا ہے

محمد ذوالقرنین جواد حالی/حاصل پور

تبصرۂ کتب

نام کتاب : رنگِ نمو
شاعر : محمد یعقوب اطہر پنوار
تبصرہ نگار : محمد رضا سالک

میری دانست اور تجربے کے مطابق محمد یعقوب اطہر اردو زبان کا ایک اُبھرتا ہوا شاعر ہے۔ موصوف کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کے ساتھ جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ان کی ابتدائی شاعری کو اگر غور سے پڑھو تو یہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور فن شاعری سے بہت دور اور ناواقف نظر آتا ہے۔ جس کا اعتراف انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''اکیلے دشت میں'' کیا ہے۔ جب شاعر موصوف کو اپنی اس کمزوری کا پتہ چلا تو انہوں نے میدان شاعری میں اپنے لیے اُستاد ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ سیانے کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے۔ آخر کار ان کی فیس بک پر ممبئی (انڈیا) کے ایک اُستاد شاعر ابراہیم اشک سے ملاقات ہوگئی جس کی راہنمائی میں انہوں نے اپنی شاعری کے پیچ و خم سیدھے کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ آج محمد یعقوب اطہر گردش دوراں کو جھاگ کر بے مثال اور خوبصورت شاعری کرتے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان کی شاعری کا منفرد انداز درج ذیل شعر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتنے کانٹوں نے لب کیے زخمی
جب کوئی پھول چومنے نکلے

نام کتاب : نسخہ ہائے غم
شاعر : محمد یعقوب اطہر پنوار
تبصرہ نگار : سیّد فضل گیلانی

میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کے تین مراحل ہوتے ہیں ایک قبل از شعر دوسرا دورانِ شعر اور تیسرا بعد از شعر۔ سو جو تیسرا مرحلہ ہے وہ مذکورہ دونوں مراحل سے زیادہ کٹھن اور محنت طلب ہے جس میں شاعر اپنی غزل کو فنی نکتہ نگاہ، ابلاغ، روانی الغرض مختلف جہتوں سے پرکھتا اور سنوارتا ہے۔ یعقوب اطہر ان تینوں مراحل سے نہ صرف بخوبی آشنا ہیں بلکہ روایت کا بھی مکمل ادراک رکھتے ہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ انہوں نے روایت اور جدت میں سے اپنا راستہ نکالا۔ ان کی غزلیات کی بنیادی خوبیوں میں روانی، مترنم بحور، موسیقیت اور شعریت کے ساتھ ساتھ معاشرے پر گہری نظر اور فکر بھی ہے۔ سہلِ ممتنع میں بیشتر کلام دل آویز ہے۔ شعر کا سفر شاعر کی حیرت اور مشاہدے کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ مالکِ سخن مزید برکت اور کامیابی عطا فرمائے۔

نام کتاب : ستارے دیکھتے رہنا
شاعر : انجینئر ظفر محی الدین
تبصرہ نگار : حسن عباسی

انجینئر ظفر محی الدین کی شاعری اور شخصیت کی بات کریں تو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دونوں میں زیادہ بہتر کون ہے۔ اچھے انسان اور اچھے دوست کی جو بھی تعریف متعین کی جائے اُس پر وہ پورا اُترتے ہیں اسی طرح وہ اتنے اچھے شاعر بھی ہیں جتنا کسی شریف آدمی کو ہونا چاہیے۔ انجینئرنگ کے شعبہ میں ہونے کی وجہ سے کام میں Perfection اُن کے مزاج کا حصہ ہے۔ اُن کا کوئی بھی شعری مجموعہ اُٹھا کے دیکھ لیں وہ ظاہری اور باطنی حُسن کا پیکر ہوگا اور اسے کہیں سے بھی کھول کے پڑھنا شروع کر دیں تو آپ بہت اچھی اور معیاری شاعری سے لطف اندوز ہوں گے۔ انجینئر ظفر محی الدین کی شاعری مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے معتبر ہے۔ وہ دو پنجابی اور تین بھرپور اُردو شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ ''بھرپور'' کا لفظ میں نے اس لیے برتا ہے کہ ان کا کوئی بھی شعری مجموعہ منفرد حیثیت اور الگ شناخت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ''عشق'' میں شامل تمام غزلیات اور اُن کے اشعار نہ صرف عشق کے موضوع پر ہیں بلکہ ہر شعر میں لفظ عشق بڑے سلیقے اور قرینے سے برتا گیا ہے۔ اُردو میں ''عشق'' کے موضوع پر شاعری تو بہت ہوتی ہے مگر جس طرح انجینئر ظفر محی الدین کے ہاں ہمیں مضامین کی رنگا رنگی اور فراوانی نظر آتی ہے اُس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اسی طرح ان کو یہ اختصاص بھی حاصل ہے کہ وہ اُردو کے پہلے مکمل دیوان کے خالق ہیں یعنی حروفِ تہجی کے ہر حرف پر غزل کہی ہے اور وہ بھی ایک دو تین یا چار نہیں بلکہ پوری پانچ پانچ غزلیں۔ اُس سے ان کی شعر پر فنی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

انہوں نے اپنے شعری سفر میں آنے والوں کے لیے مشکل راستہ چھوڑا ہے جس پر چلنے کے لیے بھرپور تخلیقیت، محنت اور ریاضت درکار ہے، جس کا فی زمانہ فقدان ہے۔ انجینئر ظفر محی الدین کا شعری سفر آج بھی اُسی لگن، شوق اور ولولے کے ساتھ جاری ہے۔ جیسا کہ پہلے دن سے تھا۔ ''ستارے دیکھتے رہنا'' اسی سفر کا چھٹا پڑاؤ ہے۔ کتاب کے نام سے اُن کی جستجو، عزم، بلند حوصلگی اور منزل کے تعین کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے دیگر شعری مجموعوں کی طرح ''ستارے دیکھتے رہنا'' بھی جمالِ شعر اور کمالِ فن کا مرقع ہے۔

نامہ ہائے احباب

پیارے حسن عباسی صاحب، ایڈیٹر ''ارژنگ'' لاہور
السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

ہمارے لیے یہ امر نہایت مسرت و شادمانی کا باعث ہے کہ ارژنگ کی مجلس ادارت میں آپ جیسے ادب پرور اور علم دوست احباب موجود ہیں جن کی مخصوص روش قابلِ صد تحسین و داد ہے کہ لاہور جیسے ثروت مند ادبی ماحول میں رہ کر بھی دور دراز کے ادبی حلقوں سے محبت اور چاہت کے جذبوں سے سرشار ہیں۔ یقیناً یہی اطوار مجموعی طور پر قومی سطح کے ادب کی پرداخت کے امین ہوتے ہیں۔ ارژنگ کے ہر شمارے میں وطن عزیز کے کونے کونے سے بھیجی گئی ادبی شذرات کو مناسب مقام دینا اور بڑے ادبی مراکز سے طویل دوری پر ہونے والی ادبی کاوشوں کی اشاعتی سرپرستی کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کام کے لیے بالیدہ سوچ و فکر اور صحیح معنوں میں ادب پروری کے صالح روّیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور الحمدللہ آپ اور آپ کی ٹیم اس جذبے سے مالا مال ہے۔

ارژنگ کی اشاعتی ترتیب کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوتا ہے۔ خصوصاً حمد و نعت کی اشاعت کا عمدہ اہتمام قابل ستائش ہے۔ دیگر ادبی تحاریر کا ایک اچھے پیرائے میں شامل ہونا الگ داد کا متقاضی ہے۔ گزشتہ شمارے میں شامل اعلیٰ اُدبی معلوماتی مضامین، عمدہ افسانے، محترمین امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر وحید احمد صاحبان کے تفصیلی انٹرویوز اور مختلف مقامات کی ادبی خبریں اپنی اپنی جگہ پر قابل تعریف ہیں۔ پیارے دوست نیازت علی نیاز اور استادِ محترم پروفیسر آصف ثاقب صاحب سے جب کبھی ادبی ملاقاتیں ارژنگ کے توسط سے ہوتی ہیں تو سماں ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ارژنگ کے مزید نکھار کی دعا کے ساتھ۔

عبدالوحید بسمل/ ایبٹ آباد

محترم و مکرم جناب عباسی صاحب!
سلام مسنون!

ماہنامہ ''ارژنگ'' جس رفتار سے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، اسے لفظوں میں سمیٹنا آسان نہیں۔ بلاشبہ اس کا کریڈٹ عامر بن علی، حسن عباسی، لبنیٰ صفدر، نازاوکاڑوی اور آپ کی مستعد ادبی ٹیم کو جاتا ہے۔ اردو ادب کے منظر نامے کو ثروت مند کرنے میں ارژنگ کا حصہ بہر طور نمایاں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ٹوٹے ہوئے تارے کو مہ کامل بننے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ان شاءاللہ!

لفظ قاصر ہیں کس طرح لکھوں
حسن ارژنگ جلیل لفظوں میں
اس دعا کے ساتھ اجازت......
ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

احمد جلیل/ اوکاڑہ

محترم حسن عباسی صاحب!
آداب! اُمید ہے بخیر ہوں گے۔

''ارژنگ'' موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح تازہ دم اور شاندار۔ میں خط تو آپ کے ایڈریس پہ بھیجتی ہوں۔ اب یہ نہیں پتا کہ ملتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ کافی عرصے سے میری کسی تحریر کو جگہ نہیں ملی۔ خیر یہ تو آپ کی صوابدید پر ہے۔ پھر بھی اچھا لگتا ہے۔ رسالہ اپنی شاندار تحریروں کے باعث منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ عامر بن علی صاحب کا کیا گیا انٹرویو اور پھر لبنیٰ صفدر صاحبہ کی محنت بھی جھلکتی ہے۔ عمدہ افسانے، شاعری، گوشہ شاعری، جو ہمیں ابھی تک نصیب نہیں ہوا میرا مطلب گوشہ شاعری، خیر کبھی اس قابل سمجھ ہی لیں گے۔ مضامین بھی بہت ہی عمدہ ہیں۔ جو کچھ ادب میں ہے وہ سب کچھ ''ارژنگ'' میں ہے۔ ای میل پر افسانہ بھیج رہی ہوں۔ پسند آئے تو جگہ دیجیے گا۔ اللہ اور ہمت دے کہ اس طرح ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

عامر بن علی کی ادبی کاوشوں اور ان کی ترقی پر مبارک باد!!

آسناتھ کنول/ لاہور

محترم حسن عباسی صاحب!
اسلام علیکم۔ اُمید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔

''ارژنگ'' کا نیا شمارہ موصول ہو گیا ہے۔ بے حد شکریہ!!

آئندہ کسی شمارے کے لیے آپ کو اپنی ایک تحریر بعنوان ''چوبیس برس بیت گئے'' ارسال کر رہا ہوں۔ اگر معیار پر پوری اُترے تو ضرور شائع کیجیے گا۔

روبنسن سیموئیل گل/ راولپنڈی

محترم عامر بن علی!
سلام۔ ارژنگ کے آمدہ شمارے میں اشاعت کی نیت سے دو غزلیں ارسال فرما رہا ہوں۔ مہربانی کیجیے گا احسان مند۔

ازور شیرازی/ مانسہرہ

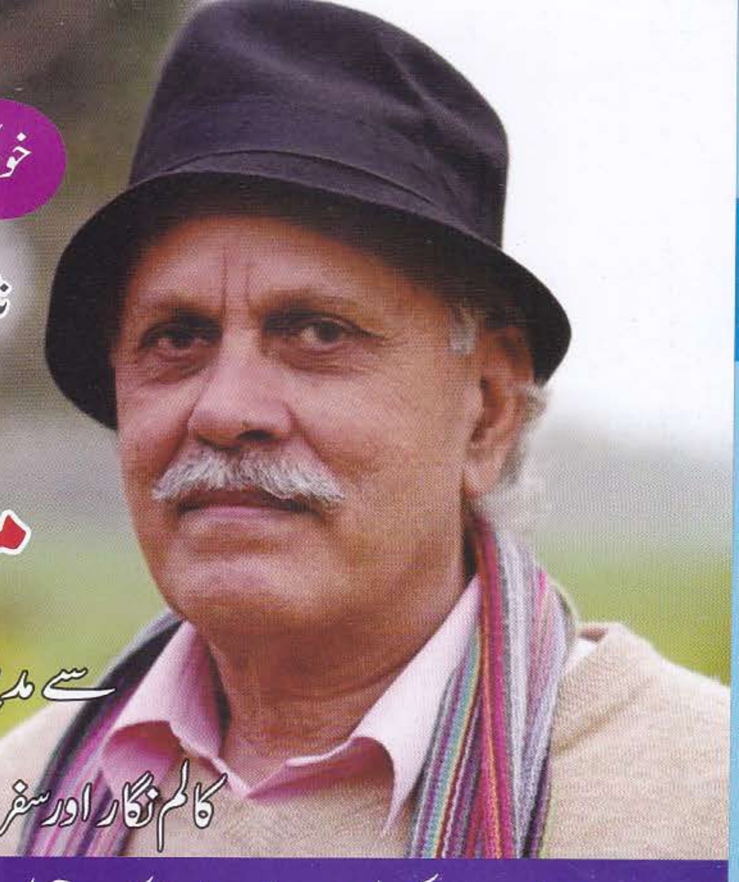

خودکوترقی پسند کی بجائے عوام دوست مصنف کہلوانا پسند ہے۔

نامور شاعر، مقبول ادیب، صحافی، محقق، مترجم، براڈکاسٹر
اور پنجابی زبان کے فروغ کے لئے متحرک

مشتاق صوفی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کا مکالمہ

پنجابی زبان کی طرف رغبت کا محرک اجمل نیازی بنے تھے جو کہ نیو ہوسٹل میں میرے سینئر تھے

مشتاق صوفی پاکستانی ادب اور میڈیا کا ایک ناقابل فراموش حوالہ ہیں۔ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی اخبار میں مختلف موضوعات پر مستقل کالم لکھتے ہیں۔ پنجابی زبان کی ترویج کے لئے ہمہ وقت متحرک رہتے ہیں۔ تمام زندگی شعروسخن کی آبیاری میں گزری ہے اور آج بھی ان کا تخلیقی سفر پوری آب و تاب اور ولولے سے جاری ہے۔ ادب کا بہت گہرا مطالعہ اور سیاسی وسماجی زندگی کا بہت قریبی مشاہدہ رکھتے ہیں۔ گزشتہ ایک برس سے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش جاری تھی جو آج آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

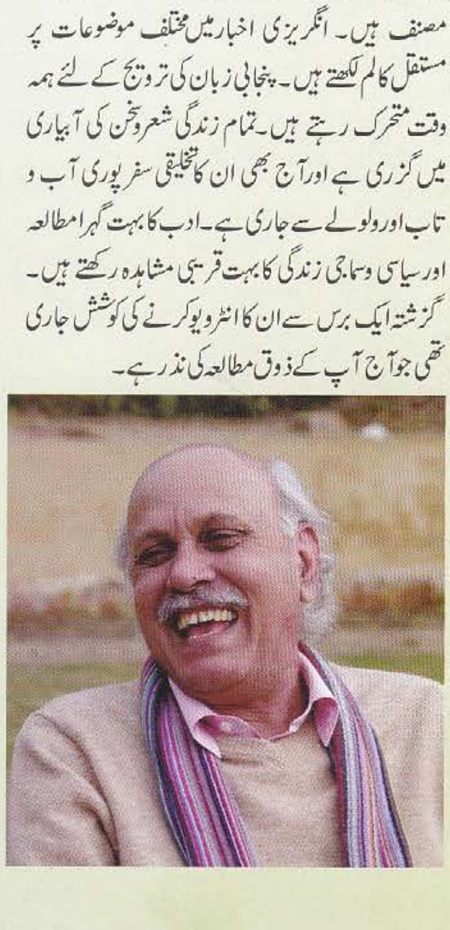

ارژنگ:۔ بات کا آغاز ابتدائی زندگی سے کرتے ہیں۔ بنیادی تعلیم وتربیت اور بچپن کہاں گزرا؟

مشتاق صوفی:۔ میری پیدائش ساہیوال میں ہوئی تھی۔ ہمارا گاؤں شہر کے پاس ہی تھا۔ چند کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ککھاں والی روڈ پر ہمارے گاؤں کا ساہیوال سے فاصلہ چار اور ہڑپہ سے دس کلومیٹر دوری ہوگی۔ یاد رہے یہی وہ قدیمی سڑک ہے جو لاہور کو ملتان سے ملاتی ہے۔ کسان گھرانہ تھا ہمارا۔ گزراوقات کاشتکاری پر ہوتی تھی۔ میرا بچپن وہیں گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ایف اے میں نے ساہیوال سے کیا اور پھر تھرڈ ائیر میں آکر لاہور میں داخلہ لے لیا۔ گریجوایشن اور ماسٹرز پھر لاہور سے ہی مکمل کیے۔

ارژنگ:۔ یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ تحریر کو ذریعہ اظہار بنایا جائے؟ لکھنے کی طرف کب اور کیسے راغب ہوئے؟

مشتاق صوفی:۔ دلچسپ بات ہے، لکھنا، پڑھنا اور شعروسخن تو بچپن میں دور کی بات لگتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک نائی ہوتا تھا۔ وہ ہر دس، پندرہ دن بعد ہمارے بال کاٹنے کے لئے آتا تھا۔ بڑا ہینڈسم اور خوبصورت جوان تھا۔ اس کی عادت تھی کہ بال کٹنے کا خوف ہم بچوں کے دل سے دور کرنے کے لئے وہ ہمیں ہنسانے کی کوشش کرتا تھا، لطیفے اور شعر سناتا تھا۔ خدا بخش نائی کا یہ ہنر مجھے بہت لبھاتا تھا شعر تو اتنا سمجھ میں نہ آتے تھے مگر ان کا ردھم اچھا لگتا تھا۔ وہاں سے کچھ سمت ملی اور طبیعت میں موزونیت تو شاید پہلے سے ہی موجود تھی۔ چونکہ شعر سننا اچھا لگتا تھا۔ شاعری باقاعدہ طور پر میں نے اس وقت شروع کی جب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھنے کے لیے آیا۔ یہ ایم اے کرنے کے دوران زیادہ نکھر کر سامنے آئی۔

ارژنگ:۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھنے کا تجربہ کیسا رہا؟ اس دور کو کیسے دیکھتے ہیں؟ آپ کی شخصیت میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اس درس گاہ میں پڑھنے سے؟

مشتاق صوفی:۔ میرے نزدیک اس دور میں گورنمنٹ کالج کے تعلیمی معیار سے بھی بڑھ کر اہم اس کا کلچر تھا۔ مجھے اس ماحول نے بہت متاثر کیا۔ وہاں بات کرنے کی آزادی تھی۔ چھوٹے شہروں میں بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ اس دور میں جیلانی کامران ہمیں پڑھاتے تھے۔ ان سے بہت سیکھا۔ پھر فرانس سے پڑھ کر آئے ہوئے لئیق بابری جو ہمیں فرانسیسی پڑھاتے تھے، بہت ہی عمدہ اور نفیس آدمی تھے۔ میری طرح پنجابی میں شاعری کرتے تھے، یہی باہمی دلچسپی ہماری قربت کی وجہ بھی بن گئی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

نجم فیلوز ہاؤس آف آرٹ اینڈ لٹریچر کے زیرِ اہتمام

عامر بن علی کے اعزاز میں نجم آرائی

بمقام نجم فیلو سٹوڈیو، پارک ویو سٹی لاہور

صدارت نذیر قیصر
مہمان خصوصی ڈاکٹر غافر شہزاد
میزبان جی اے نجم

نذیر قیصر، غافر شہزاد اور عامر بن علی

جی اے نجم صاحب شام کو پھول پیش کر رہے ہیں

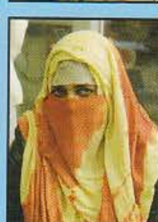

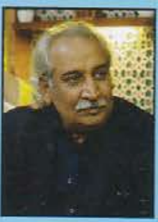

ملک بھر سے شعراء شریک ہوئے اور کلام پیش کیا

شرکاء کی بڑی تعداد نے محفل کو رونق بخشی

تحائف کا تبادلہ کیا گیا

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com